آئینۂ حیرت

سید رفیق حسین

ناشر

ساقی بک ڈپو۔ دہلی

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

قیمت دو روپئے — طبع اوّل

ترتیب

١ ۔ کفن ۵

٢ ۔ کلوا ٢٦

٣ ۔ بیرو ۴٢

۴ ۔ گوری ہو گوری .. ٦٠

۵ ۔ آئینہ حیرت .. ٧٢

٦ ۔ ہر فرعونے راموسیٰ .. ١٢٢

٧ ۔ شیریں فرہاد .. ١۴٨

٨ ۔ بے زبان .. ١٧٣

کہنے کی باتیں

کوئی چار سال کی بات ہے، ایکدن ساقی کی ڈاک میں ایک مسودہ آیا جسے دیکھکر ہی وحشت ہونے لگی۔ یہ مسودہ کھُلا کھُلا اور بڑے ہی بیڈھنگے خط میں لکھا ہوا تھا۔ دل نے کہا کہ اسے بغیر پڑھے ہی واپس کر دو۔ مگر دماغ نے ٹوکا کہ یہ تو ادارتی دیانتداری کے خلاف ہوگا۔ مضمون نگار کا نام دیکھا تو وہ بھی پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ خیر طبیعت پر جبر کرکے اسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے مضمون پڑھتا جاتا تھا جبر و اکراہ رخصت ہوتا جاتا تھا۔ یہانتک کہ جب مضمون ختم ہوا تو میں حیران تھا کہ یہ کیسا جواہر پارہ اس بدنما پلندے کی صورت میں میرے ہاتھ لگا، افوہ بظاہر بھی کتنا فریبی ہوتا ہے! اگر میں دل کا کہنا مان لیتا تو ایک جوہر قابل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رُوپوش ہو جاتا۔ کیونکہ یہ لکھنے والے کا پہلا افسانہ تھا جو بہت جھجکتے جھجکتے ساقی کیلئے بھیجا گیا تھا۔ اور اس تاکید کے ساتھ کہ اگر پسند نہ آئے تو مسودہ ضائع کر دیا جائے۔ یہ افسانہ تھا "کفارہ" اور لکھنے والے کا نام تھا سید رفیق حسین۔ افسانہ چھپا، اشتیاق سے پڑھا گیا اور آئندہ کیلئے ناظرین کو مشتاق بنا گیا اور پھر کلوا اور بیرو کے شائع ہونے پر تو رفیق حسین نے گویا جھنڈے ہی گاڑ دیئے۔ اور افسانوی ادب کے محترم نقاد مولانا صلاح الدین احمد صاحب نے ادبی دنیا کے ادبی جائزہ میں کئی صفحات میں اس افسانہ کی خوبیوں کو اُجاگر کیا۔ اور پھر وہ معرکۃ الآرا افسانہ ساقی کے کسی خاص نمبر میں شائع ہوا جس سے اس کتاب کا نام موسوم ہے "آئینۂ حیرت"۔ ان افسانوں میں جانوروں کی نفسیات کے علاوہ جو بجائے خود ہر افسانہ کی ایک نادر خوبی ہے ایک اور خوبی بھی ہے۔ انسانی سرشت کی تحلیل کہانی کے پیرایہ میں۔ اور یہ دونوں خوبیاں ہر افسانہ میں آپکو متوازی نظر آئینگی لیکن اس ہنرمندی اور سلیقے کے ساتھ کہ کہیں بھی یہ دورنگی افسانے کی وحدتِ تاثر میں فرق نہیں آنے دیتی۔ بلکہ یہ تقابلی مطالعہ ہی رفیق حسین کی وہ خصوصیت ہے جو انھیں فنکاروں سے اٹھاکر حُسن کاروں میں جگہ دیتی ہے۔

دہلی

۵۔ مارچ ۱۹۴۴ء

شاہد احمد دہلوی

کنگال

ریل سے اُتر کر اگر شاہ گنج گڈھا اسٹیشن سے ٹھیک شمال کی طرف روانہ ہو تو پانچ گاؤں چھوڑ کر اخیر گاؤں سُکھ داس پور آتا ہے۔ اس کے بعد دو میل سے بھی زیادہ چوڑے میدان کو پار کر کے نگاہیں ایک سبزی مائل سیاہ دیوار پر رُکتی ہیں۔ جو کہ دائیں ہاتھ پر سارد امہر کی اونچی پٹڑی سے شروع ہو کر ذیں طرف دُھندلی پڑتے پڑتے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ دیوار نہیں ہے بلکہ ترائی کے جنگل کا وہ حصہ ہے جسے مصطفےٰ آباد ریخ کہتے ہیں۔ چونکہ اس جنگل میں چوپاؤں کی کثرت ہے۔ اس لئے اس میدان میں سوائے گیہوں کی ایک فصل کے اور کوئی کاشت نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس طرح پر کہ کنارے کے تمام گاؤں کے لوگ متفق ہو کر جنگل کے کنارے کنارے میلوں میل تک کانٹے دار درختوں کی شاخوں سے ایک باڑھ کھڑی کر دیتے ہیں جس سے کچھ بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ورنہ دراصل یہ دس بارہ میل کا لمبا اور ڈھائی میل کا چوڑا گیہوں کا ایک تختہ خود بچاؤ ہے۔ اتنی بڑی کھیتی میں نقصان ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ رات کے آٹھ بجتے ہی جگہ جگہ پر سانبھر سانبھر سب سے بڑے قسم کا بارہ سنگھا ہوتا ہے۔ مگر سینگ آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ چار شاخیں ایک طرف اور چار دوسری طرف۔ جسم کا رنگ مٹیالا ہوتا ہے۔

اور چیتل[1] منہ اونچا کر کے اپنے پھیلے ہوئے شاخدار سینگ لپیٹ پر ملا کر تھوتنے بھر راستہ ڈھونڈھ لینے کے بعد بے تکلف اندر آجاتے ہیں۔ ان کے پھیلے ہوئے سینگ کانٹے دار لکڑیوں کی دیوار کو چیر کر ان کے جسم سے زیادہ چوڑا راستہ بنا دیتے ہیں۔ رات بھر چرنے کے بعد دن پھوٹنے کی ہلکی روشنی پر یہ جانور پھر اسی طرح واپس نکل کر جنگل میں گھس جاتے ہیں۔

ہولی کو جلے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ رات کے دو بجے ہیں، چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ کانٹوں کی باڑھ سے کچھ دور گھٹنوں تک اونچے کھیت میں چھ چیتلیں کھڑی ہوئی اطمینان سے آدھے سوکھے گیہوں کے پتے ایک ایک کر کے چن رہی ہیں۔ کھیت کے کنارے پر ایک جگہ فٹ دو فٹ کا گیہوں کا ایک گچھا، جیسے کہ اکثر رہ جاتے ہیں اب بھی سبز ہے۔ اس میں تین اور چیتلیں چھپی ہوئی ہیں۔ ان کے برابر ہی کھیت سے باہر شاندار چھانکٹ[2] موٹی گردن اینٹھائے پھیلے ہوئے بارہ سینگ تاج کی طرح لگائے خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا ہے۔ ہاتھ پیر، سر یا آنکھیں کسی کو بھی جنبش نہیں ہے۔ صرف کان وقتاً فوقتاً ادھر کو ادھر، ادھر سے ادھر پھر جاتے ہیں۔ آنکھیں اس قدر تیز نہیں ہیں کہ برابر گھنے جنگل کی تاریکیوں میں پتہ چلا سکے۔ ہوا بھی مخالف ہے۔ کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے۔ اس لئے بو بھی نہیں لے سکتا ہے۔ کانوں ہی سے کام لے رہا ہے۔ دور گھنے میں تھوڑی دیر بعد ہلکی کھس کھس ہوتی ہے۔ دائیں ہاتھ پر کسی جگہ سے بہت خفیف کھٹ کھٹانے کی آواز آ رہی ہے۔ ان دونوں آوازوں کی اسے مطلق پرواہ نہیں ہے۔ یہ صاف پہچان گیا ہے کہ

۱۔ سانبھر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ نر کے بارہ شاخیں ہوتی ہیں۔ کتھئی بدن پر سیاہ حاشیہ سے گھرے ہوئے سفید گل ہوتے ہیں۔

۲۔ مادین چیتلیں کہلاتی ہیں اور ان کا نر چھانکٹ۔

یہ آواز نیولی کے بچوں کے کھیلنے کی ہے اور دوسری جنگل کی نیلی کھٹ کھوڑھی کے درخت کی چھال میں سے کیڑے چُننے کی ہے۔ جھابک اس فکر میں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی سال کے درختوں میں وہ جو زمین سے ملی لمبی سی چیز کی ہلنے کا شبہ سا ہوا تھا۔ دراصل وہ شیر ہی تھا یا کچھ اور؟ صرف ایک خفیف سی سوکھے پتّے کی پیر کے نیچے چرچرانے کی آواز اس کو سارا ماجرا بتا دینے کے لئے کافی ہے۔

لیکن کیا مجال کہ شیر یا شیرنی کا پیر بے جا پڑ جائے۔ حالانکہ سال بن کی تمام زمین پت جھڑ کے سوکھے پتّوں سے بچھی پڑی ہے۔ لیکن یہ دونوں بغیر ایک پتّے کو بھی چرچرائے یا کھس کھسائے یہاں آکر دیمک کی بنائی ہوئی چھوٹی سی دیوار کی آڑ میں اسی گلّے کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے ہیں۔ ایلہ چھیلوں اور ان کے درمیان بھٹ[1] کے چوڑے پتّوں اور مرور پھلی[2] کی لمبی شاخوں سے اس قدر آڑ ہو گئی کہ نظر ان دونوں کو بھی کچھ نہیں آرہا ہے۔ پھر بھی دونوں اطمینان سے دب کے بیٹھے ہیں۔ تیز ہوائیں جو کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے۔ چھیلوں کی بُو اور ان کے ہلنے جُلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

دفعتاً شیرنی کو ہوا میں ایک نئی بُو معلوم ہوتی ہے۔ گھبرا کر شیر کی طرف سر گھماتی ہے۔ شیر نے کوئی نئی بُو محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہتا ہے کہ اتنے میں پھر تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ اب شیر کو بھی یہ نئی بُو معلوم ہوتی ہے۔ شیر جھنجلا کر دونوں کان آگے جھکاتا ہے۔ لیکن شیرنی پریشان ہو کر کھڑی ہو

---

[1] جنگلی پودا، پتّے بڑے ہوتے ہیں۔ کو دو فٹ ڈیڑھ فٹ اُونچا ہوتا ہے۔
[2] جنگلی سَن۔ یہ جھاڑوں کی طرح اُگا ہوتا ہے۔ چار سے پانچ فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔

جاتی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا پھر آتا ہے۔ اب شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ سے گھوم کر شمال سے مشرق کی طرف چل دیتے ہیں۔

باہر کھیت میں جھانک اب بھی اسی طرح کھڑا ہے۔ سبز گچھے پر اب بجائے تین کے پانچ چیتلیں پُھدک رہی ہیں۔ باقی چار ان ہی سوکھے گیہوؤں میں سے پتے کھا رہی ہیں۔ چرتے چرتے ان چاروں کو بھی بُو معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے چاروں سر اونچا کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جھانک کی طرف دیکھتی ہے۔ جھانک جنگل کی طرف کان لگائے اسی طرح بے خبر کھڑا تھا۔ ایک چیتل کو دُور سُکھ داس پور کی سمت دُھندلی سی ہلتی ہوئی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ چیتل فوراً "کو" کی لمبی آواز لگاتی ہے۔ سُنسان رات میں جنگل کے کنارے سے آواز گونجتی ہے۔ باقی تمام چیتلیں چونک کر سر اونچے کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جھانک بھی گھوم پڑتا ہے۔ یہ تمام جانور پانچ منٹ تک پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس کھڑے رہتے ہیں۔ بُو برابر آ رہی ہے۔ لیکن دُور ہلنے والی چیز رُک گئی ہے۔ پانچ منٹ کے بعد وہ چیز پھر ہلتی ہے۔ سب چیتل ایک ساتھ جنگل کی طرف جھپٹتے ہیں کانٹوں کی باڑھ جا بجا ٹوٹی ہوئی ہے۔ چیتل ان ہی میں سے ایک راستے سے ایک کے بعد ایک قلانچیں بھرتے نکلتے ہیں۔ سب سے آخر میں جھانک بھی اس قطار میں شامل ہو جاتا ہے جو کہ چیتلوں نے بنالی ہے۔ جنگل میں گھستے گھستے وہی چیتل پھر دو دفعہ "کُو کُو" کی آواز لگاتی ہے۔ اور سب چیتل جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں۔ سامنے کچھ دور سوکھے گیہوؤں میں ایک پریشان انسان کھڑا ہے۔

پھانسی کے تختے پر بےکسی اور بےبسی کی موت سے بچنے کے واسطے بہاری گاؤں سے بچتا ہوا شاہ گڈھ اسٹیشن سے دیوانہ وار اس جنگل کی طرف آیا تھا۔

اس کے خیال میں گھنے سرسبز جنگل پھولوں پھلوں سے لدے، چھوٹے چھوٹے چشموں سے آراستہ دامن پھیلائے اس کو اپنی گہرائیوں میں چھپانے کو واسطے تیار کھڑے تھے۔ لیکن جنگل کے کنارے آتے ہی اس پر اس سمت سے بھی خوف طاری ہو گیا۔ اُس کی پُشت پر گاؤں کی اکا دکا ٹمٹماتی روشنیاں ملک الموت کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے وہ جنگل جس کو کہ یہ زندگی کا گہوارہ سمجھ کر جو یا ہوا تھا قبر کی طرح تاریک اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے اُس نے کچھ نہ دیکھا۔ نہ ناک سے کوئی بُو محسوس کی تھی صرف چڑیل کی کوکیں سُنی تھیں۔ اور ان ہی تین آوازوں نے اس کی خیالی جنت کو ہیبت ناک گھنا بن بنا دیا تھا۔ بہاری دیہات کا رہنے والا ضرور تھا بھوت پریت سے ڈرنا جانتا ہی نہ تھا۔ لیکن جنگل سے ناواقف تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کو پھر آگے پیچھے چاروں طرف موت نظر آنے لگی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ سر پکڑ کر وہیں کھیت میں بیٹھ گیا۔ اپنی بے کسی پر اُس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے لگے۔ اُس کے دماغ میں خیالات کا ایک ایسا ہیجان تھا کہ وہ کسی ایک بات کو لگاتار سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ کبھی وہ اپنی بدقسمتی کا خیال کرتا تھا۔ کبھی بیکس بُڈھے باپ اور ماں کی حالت سوچتا تھا۔ کبھی اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تھا۔ اور کبھی آئندہ زندگی بسر کرنے کا نقشہ کھینچنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر پھر کے ہر خیال میں کسی نہ کسی طرح ایک تصویر آجاتی تھی "چاندنی رات میں ایک کھیت کی مینڈ ہے اس پر ایک آدمی خون میں نہایا اوندھا پڑا ہے۔ اس کے پیروں کی طرف وہ خود گنڈاسہ لئے کھڑا ہے" اس تصویر سے بہاری لرز جاتا تھا۔ کانپ اُٹھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نہ سوچے مگر بار بار یہی خیال آجاتا تھا وہ بار بار کہتا تھا "بلدیو سنگھ کا قاتل میں ہوں تو سہی لیکن ہے رام یہ کیسے ہوا کیسے ہوا؟ ... ہاں میں نے مارا ... دو گنڈاسے سر پر ہلکے سے مارے تھے۔ اور تیسرا ہی زور سے مارا جو پیٹھ میں گھس گیا ... اس ہی سے تو گر پڑا۔

پیٹھ کا زخم ؟ . . . . نہیں پیٹھ والے سے کیا ہوا . . . . . . وہ تو پہلا ہی گنڈا سر میں گھس گیا . . . . . میں نے مارا ؟ . . . . . . یہ کیا ہو گیا تھا ؟ . . . . . .
ہے رام یہ کیا ہو گیا ؟ . . . . رے رام یہ کیا ہو گیا ؟ . . . . ہے بھگوان!
اب وہ زندہ ہو سکتا ہے ؟ . . . . ناہیں ناہیں ! . . . . . ہے بھگوان!
معافی مل سکتی ہے ؟ . . . . ناہیں ! ناہیں !! . . . . ."

اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوا نے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا کر ایک عجیب تصور پیش کر دیا۔ کیا دیکھتا ہے، بلدیو سنگھ کا باپ اس کے سامنے لڑکے کو لئے کھڑا ہے اور اُس سے کہہ رہا ہے "کنور بھیا یو ہے بہاری تمرے سامنے! اب ماپھ کر دیو۔ اچھے ہوئی جائی ہو۔" بلدیو سنگھ کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے سامنے کھڑا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھ لیتا ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ باپ دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑے کھڑا ہے اور برابر کہہ رہا ہے "بس کنور اب جان دیو ماپھ کر دیو۔ اچھے ہوئی جاؤ۔" پھر بڈھا اس کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہتا ہے۔

"بہاری تم بھی ماپھی مانگ لیو۔ بیٹھے کا دیکھ رہے ہو۔ مانگو ماپھی۔" بہاری ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہے۔ بلدیو سنگھ سر ہلا کر باپ سے کہتا ہے "معاف نہیں کروں گا۔" اب بہاری اس کے پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اس پر وہ کہتا ہے "میں نا معاف کروں گا۔ بلاؤ سپاہیوں کو۔ پکڑو۔ پکڑو۔ دوڑو اسے پکڑو۔" بہاری کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں آدمی دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ وہ چونک کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ صبح کی سہانی روشنی اُسے بھیانک معلوم ہوئی۔ سنہرا زرد گیہوں کا کھیت موت کے ہاتھوں مٹایا ہوا نظارہ معلوم ہوا۔ کالا جنگل کا کنارہ ایک قلعہ معلوم ہوا۔ جس میں اس کو موت سے پناہ مل سکتی تھی۔ یہ فوراً اس کی طرف لپکا۔ لیکن چار قدم چلنے کے بعد اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ درختوں میں سے جھانکتے ہوئے سکھدا اس پور

کے مکانوں پر اُس کی نگاہ پڑی۔ ہر مکان اس کو مُشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بہاری جنگل کی طرف بھاگا۔ کانٹوں دار باڑھ کو پھاندتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔

جس وقت دوبارہ مُرغے نے اذان دی تو بہاری نے آنکھیں کھولدیں صبح کا ہلکا نُور پھیل رہا تھا۔ قریب ہی کسی درخت پر کوئی مور رات بھر کے سمیٹے ہوئے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے سر کی طرف اوپر کی کسی ڈالی پر ایک چھوٹی چڑیا "چیں چوں، چیں چوں" چہک رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ روشنی کے ساتھ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔ بہاری نے دن بھر کے سکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ وہ "اے بھگوان کرپا کر بھگوان" کہہ کر بیٹھ گیا۔ اور اطمینان سے وہ رسّی کھولی جس سے کہ اس نے اپنا سینہ اور کمر برگد کے دوشاخے سے باندھ رکھا تھا۔ تاکہ وہ سوتے میں درخت سے نہ گر پڑے۔ بہاری کو آج جنگل میں آئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ یہیں اُس نے مرُدڑ پھلی کی چھال سے یہ رسّی بٹ لی ہے۔ رات کو کھیت میں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر ہولوں کی طرح بھُون کر کھا لیتا ہے۔ اور پھر جنگل کے کنارے ہی کسی موٹے درخت پر چڑھ کر اس کی ڈالیوں میں اپنے کو باندھ کر سو رہتا ہے۔

دن نکلتے ہی پھر اندر گھنے میں گھس کر جنگل سے گھری ہوئی چاندر میں چھُپ جاتا ہے۔ جنگل کا جو تصوّر اس نے باندھا تھا یہاں آکر اس میں سے کچھ نہ پایا۔ سال کا جنگل دراصل ایک میدان کی طرح تھا۔ جس میں فٹ سوا فٹ اُونچے بھٹار اور کریاری کے چھوٹے پودوں میں لاکھوں سال کے درختوں کے سیدھے اور ننگے بلاشاخوں کے تنے کھڑے ہوئے پچاس ساٹھ فٹ کے اُوپر چھتری نما چند ڈالیوں سے ایک چھت تھامے ہوئے تھے۔ رات کو ان درختوں پر چڑھ رہنا اور دن میں ان کے نیچے زمین پر پھرنا ناممکن تھا۔ آٹھ نو بجتے ہی جنگل میں گئے

اور بھینسوں کے گلے" اور چرواہے آجاتے تھے۔ مزروعہ زمین کی طرف جنگل کے کنارے البتہ نیچے اور پھیلی ہوئی ڈالیوں کے درخت بھی تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے مجموعے سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی بھبیاں بھی تھوڑی دور پر تھیں۔ لیکن دن میں ان میں چھپنا ناممکن اور کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ سال بنی شمال کی طرف میلوں اسی طرح چلی گئی تھی۔ اس کے مشرق میں ساردا نہر کی شاخ ہردوئی برانچ بہہ رہی تھی۔ اور مغرب کی طرف ناقابلِ گذر کھیر کے جنگل سے ملا ایک چاندر تھا۔ اسی چاندر کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تالاب یا گڈھا تھا۔ جس کے کنارے دلدل یا کیچڑ میں بیٹھ کے اور کھڑے رہ کر بھاری دن گذارتا تھا۔ نیچے کیچڑ میں جوکیں ہاتھ پیر اور پیٹھ پر ڈالتیں اور آنکھ کے آگے صدہا بھنگے اُسے ستاتے تھے۔ جنگل کا چاندر صدہا جنگلی سینٹھوں پتاوروں اور گھاسوں کا ایک اُبسا اونچا اور گھنا ٹکڑا ہوتا ہے جس میں کہ انسان کو پورا پیر رکھنا محال ہوتا ہے۔ اونچائی میں ہاتھی مع ہودہ اس میں چھُپ جاتے ہیں۔ چاندر میں کبھی کوئی ایسا قد آور درخت نہیں ہوتا جس پر کہ انسان چھ سات فٹ بھی اُوپر چڑھ سکے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ چاندر کی ٹٹھیرے نما گھاسوں کو کچل کر دو فٹ جگہ بنالے تو یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ بغیر کسی مضبوط ہتیار کے نہیں کٹ سکتیں۔ پھر اب موسم بھی اور ہے۔ ہولی جل چکی ہے۔ سبز لہلہاتے چاندر کو چار مہینے کی سخت سردی نے مار کر سکھا دیا ہے۔ یہاں نہ اب چڑیاں چہچہاتی ہیں نہ کالا تیتر بولتا ہے۔ کھڑکھڑاتا ہوا بھورا چاندر ایک چنگاری کا منتظر ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح ہر چاندر میں پہونچ کر ان مُردہ گھاسوں کو فنا کی آخری منزل میں پہونچا دیتی ہے۔ اور جب چاندر جل کر بھوری اور سیاہ راکھ سے ڈھکا ہوا نکل آتا ہے تو اس ارتھی کی خاک سے آنے والی نسل کے بے خبر نونہال پودے ہنستے ہوئے سر نکالتے ہیں ـــــ ظالم ـــــ ظالم ـــــ قدرت کے قوانین ظالم ہیں۔

چاندر اُگتا ہے ـــــ وہ ہستیاں جو کبھی حیات کی طالب نہیں ہوئی تھیں،

حالتِ بے خبری میں وجود میں لا کر اس دنیا میں گرم و سرد جھونکے برداشت کرنے کیلئے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ عرصۂ حیات کم ہے، مصائبِ عالم بھی ہیں، موسم کی سختیاں بھی ہیں۔ وجود کی جد و جہد بھی جاری ہے کہ بیڑا پار لگ جاتا ہے اور پھر وہی ہوتا ہے ــــ ظلم ــــ ظلم ــــ قدرت کے قوانین کیسے ظالم ہیں۔ قد آور درخت، چھوٹے پودے، لاکھوں قسم کی گھاسیں۔ بڑے بڑے جانور اور درندے چوپائے اور پرندے۔ چھوٹے چھوٹے جانور، کروڑہا قسم کے کیڑے اور انسان سب اسی قانون کے تابع پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چکی چل رہی ہے۔ دانے ڈالے جا رہے ہیں۔ آٹا نکل رہا ہے۔ شاید یہ عالم ہستی خود کسی گناہِ عظیم کا کفارہ ہے۔

بہاری بڑی دیر تک ہاتھ میں رسی لئے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے برگد کی چھال کو کریدتا ہوا اسی ڈگالے پر بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ جنگل کی اس زندگی سے اتنا عاجز آ چکا تھا کہ اب اس بات پر بالکل آمادہ تھا کہ پاس کے کسی گاؤں میں جا کر فقیر یا سادھو کے بھیس میں قسمت آزمائے۔ اگر پکڑا بھی گیا اور پھانسی پر بھی لٹکنا پڑا تب بھی گوارا تھا۔ لیکن وہ تکلیفیں جو اب وہ اٹھا رہا تھا ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس سوائے ماچس کے ایک بکس کے اور چند بیکار روپئوں کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ کاش کہ ایک چاقو ہی ہوتا۔ دیا سلائیاں بھی ختم ہونے کو قریب آ چکی تھیں۔ دیا سلائی کا خیال آتے ہی اس نے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب سے ماچس کا بکس نکال کر اس کی تیلیاں گننے کے بعد نہایت احتیاط سے پھر اس کو جیب میں رکھ کر "بھگوان! دیا کر بھگوان" کہتے ہوئے درخت سے نیچے اترنا شروع کیا۔ جب آخری ٹہنے پر آ گیا تو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس میں لٹک گیا۔ اس کے پیر اب بھی زمین سے چار فٹ اونچے ہونگے۔ کہ اس نے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور دھم سے زمین پر آ رہا سنبھل نہ سکا۔ ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ساٹھ فٹ کے فاصلہ پر ایک عورت کی "ارے دیا" چلانے کی آواز آئی۔ سر گھما کر دیکھا تو ایک عورت رفع حاجت کرتے سی لٹیا

لُٹیا چھوڑ کر بھاگی چلی جا رہی ہے۔ بہاری بھی گھبرا کر اُٹھا جنگل کے اندر کی طرف بھاگنے مگر فوراً ہی لُٹیا کا خیال آیا۔ بھاگتا ہوا اُس تک گیا۔ اُسے اُٹھا رہا تھا کہ کپڑے کی بڑی سی ایک پوٹلی اور نظر آئی۔ اس نے اُسے بھی اُٹھا لیا اور لُٹیا کا پانی گراتا ہوا عورت سے دوسری سمت کو بھاگا۔ فاقوں اور مصیبتوں سے جسم لاغر ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دُور میں سانس پھول گیا۔ بھاگنا بند کر دیا۔ تیز قدم اُٹھاتا اسی چاندر میں گھُس گیا۔

چاندر میں پہونچ کر بہاری نے اس پوٹلی کو کھولا تو اس میں سے ایک کھُرپی، ایک ہنسیا۔ چھٹانک بھر کے قریب تمباکو۔ چلم۔ ایک دیا سلائی کی ڈبیہ اور کوئی سوا سیر آٹے کی روٹی۔ اور بینگن کی بھاجی نکلی۔ بہاری نے فوراً کھُرپی اور ہنسیا کی مدد سے چاندر میں ایک خشک جگہ تھوڑی سی زمین صاف کی۔ اس کے بعد لُٹیا میں پانی بھر کر لایا۔ آٹھ دن ہو چکے تھے۔ سیر ہو کر روٹی کھائی۔ پھر آگ جلا کر چلم بھری۔ اور اطمینان سے پیتا رہا۔ عرصے کے بعد یہ نعمتیں ملی تھیں۔ روٹی اور تمباکو دونوں کا نشہ چڑھا وہیں پڑ کر سو گیا۔ دن کے دس بجے سویا، شام کے چار بجے اُٹھا۔ درخت پر نیند کہاں بھرتی تھی۔ اب جو سو کر اُٹھا تو خواہ مخواہ طبیعت پر ایک طرح کی بشاشی تھی۔ صبح کو ہراساں ہو کر وہ گانوں میں جانے کیلئے بالکل تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اب اس کے خیالات بدل گئے۔ زندگی کا چسکا پھر زندہ ہو گیا۔ ہنسیا کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ گیہوں کی کٹائی شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت اُسے یہ فکر تھی کہ جلد سے جلد جس قدر گیہوں کھیتوں سے کاٹ سکتا ہو کاٹ کر جنگل ہی میں کہیں چھُپا دے۔ ورنہ جب گیہوں نہ رہیں گے تو کیا کھائے گا۔ آبادی میں واپس جانے کو اب اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اُس کو یقین تھا کہ اگر وہ انسانوں میں گیا نہیں کہ پکڑا گیا۔ اُس نے تصفیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے فی الحال تو جنگل ہی میں چھپا رہے۔ دنوں کے بعد پیٹ بھر روٹی نے اُس میں ایک نئی روح ڈال دی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ آئندہ

کے منصوبے گانٹھتا ہوا چاندر سے نکل کر جنگل کی سوفٹی[1] سڑک کے کنارے آہستہ
آہستہ آ رہا تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف سڑک کے دوسرے کنارے پر اس کی
نگاہ پڑی۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سے شیر چلا آ رہا ہے۔ سر سے پیر تک پسینہ آگیا،
بُت بن کر جہاں کا تہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بہاری کو یقین سا ہو چکا تھا کہ اس جنگل
میں شیر یا بھیڑیا کوئی نہیں ہے۔ آج اُس نے پہلی دفعہ شیر کو دیکھا تھا۔ لیکن شیر
اس کو دو دفعہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ اور آج تیسری دفعہ آمنا سامنا ہی ہو گیا۔ شیر
نے اُس کو دیکھ کر اپنا بھاری شاہانہ چہرہ تمکنت سے پیچھے پھیر کر ایک لمحہ کے واسطے
کچھ دیکھا۔ اور پھر نہایت شان اور اطمینان کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا بالکل
آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ بہاری سکتہ کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا کہ شیر کے پیچھے ایک
اور شیر تیز قدم آ رہا ہے۔ یہ شیرنی تھی۔ پورے دن پیٹ سے ہونے کی وجہ سے
اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ جونہی شیر کے قریب آئی اس کی بھی نگاہ بہاری
پر پڑی۔ ہلکی سی غراہٹ اس کے منہ سے نکلی۔ شیر اور آہستہ ہو گیا۔ جونہی شیرنی
اس کے بائیں ہاتھ کی طرف برابر میں آئی شیر پاس کے جنگل کی طرف گھوم پڑا۔ اور
اس طرح ناراض شیرنی کو اپنے پہلو سے دھکیلتا ہوا ہٹا لے گیا۔ بہاری کے اس
قدر اوسان خطا ہو گئے تھے کہ شیر اور شیرنی کے جنگل میں غائب ہو جانے کے بعد بھی
وہ وہیں کھڑا تھا۔ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کدھر جائے، کیا کرے۔ آخر پھر روانہ ہوا۔
تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اُس کی پشت پر مور چلایا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں شیر
اس سے کترا کر کچھ دور جنگل کے اندر اندر چل کر پھر سڑک پر نکل آئے تھے۔ اور اسی
طرح اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بہاری کی متواتر جنگل میں موجودگی سے غصہ

---

[1] اودھ کے تمام جنگلوں میں محکمہ جنگلات کے انتظام سے سڑکیں کٹی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض
ایسی ہیں جن پر موٹر چل سکتے ہیں ورنہ زیادہ تر جھاڑیاں اُگی ہوتی ہیں۔ ان سڑکوں سے آگ کا
بچاؤ اور جنگل کے ٹکڑوں کی تقسیم وغیرہ کا قائم ہے۔

دونوں ہی کو آ رہا تھا۔ مگر شیر سمجھ دار مطمئن طبیعت کا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ معاملات نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ اُس کی ملکہ پیٹ سے ہے تنہائی کی سخت ضرورت ہے۔ یہاں یہ انسان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ دوسرے اس کی موجودگی سے دس بیس کانکرا اور پاڑے جو اس ٹکڑے میں مستقل طریقے سے رہتے تھے کوچ کر گئے ہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ چیتل اور سانبھروں کی ٹولیوں نے بھی ادھر کا آنا بند کر دیا ہے۔ غذا کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس ٹکڑے کو چھوڑ کر چوکا ڈھایا کے زنگلوں میں رہا جائے۔ چنانچہ وہ شیرنی کو لئے نکلا چلا گیا۔ چار میل کی معمولی چہل قدمی کے بعد دونوں سارده کی (اصلی نہر) کینال پر پہونچ گئے۔ سامنے چوکا ڈھایا کا پل تھا۔ مگر ان کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے دو سو قدم ادھر ہی نہر میں انھوں نے پانی پیا اور پھر تیرتے ہوئے پار نکل گئے۔

رات گئے تک بہاری گیہوؤں میں لگا رہا تھا۔ صبح دھوپ نکل آئی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ دور کھیت میں تین چار لال صافے دیکھ کر اس کی روح خشک ہو گئی۔ جلدی سے رسی کھول کر درخت سے نیچے اُترا۔ درخت کی جڑ میں چاروں طرف بن کروندوں کی گھنی جھاڑیوں نے اور اس پر پھیلی ہوئی بیلوں نے پوری آڑ کر رکھی تھی۔ یہ وہیں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مارے ڈر کے سانس بھی پوری نہ لیتا تھا۔ دل کی دھڑکن سے مجبور تھا۔ جس کی آواز اس کو نقارے کی چوٹوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اور جب سپاہیوں اور آدمیوں کے پیروں کی آہٹ اسی کی طرف بڑھتی سنائی دینے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اس نے کہا "ہے رام ایک میں اور سارا جگ میرا دشمن۔ میری کیا دُردشا ہو گئی ہے۔ میں نے کس جنم میں کون پاپ کیے تھے۔" اُس کے تصور نے چاندنی رات کا وہ نقشہ پھر اُس کے سامنے کر دیا جبکہ اس کا گنڈاسہ پہلی دفعہ بلدیو سنگھ کے سر میں کھسکتا ہوا گھستا چلا گیا تھا۔ اُس کے سیدھے ہاتھ کو تیز دھار کے زندہ ہڈی میں گھسنے کا احساس

ہونے لگا۔ بہاری نے چھُری لیکر اس خیال کو مٹا دیا۔ اور نہ معلوم کیوں اور کس لئے وہ اپنے آپ سے ہی بحث کرنے لگا۔

"میں مجرم ضرور ہوں لیکن سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ میں ہرگز ایسا نہ کرتا اگر میرے دوستوں نے مجھے شراب نہ پلا دی ہوتی۔ اور اگر بلدیو سنگھ کے باپ نے میرے اُوپر اس قدر ظلم نہ کیئے ہوتے۔ بے دخل کیا، زمین چھینی، باغ چھینا... لیکن اس کا بدلا..... لڑکے کو مار ڈالنا؟... قتل! قتل؟... قتل؟... ہاں قتل!..... میں نشہ میں تھا۔ پھر اسی حالت میں رمضانی نے آکر جوش دلایا .... جمنا میری منگیتر ہے.... میری منگیتر ہے.... اس کے گھر میں بھی تو بلدیو تھا.... جمنا!...، جمنا؟.... اب کس کی ہے؟.... ہے رام کرپا کر...."

بالکل قریب آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔ بڑے داروغہ.... خاں کی آواز آئی: "پاگل ہوئے ہو۔ کہیں ڈاکو کھیت کاٹتے ہیں؟ گیہوں چراتے ہیں؟ ڈاکو ہوتا تو کہیں نہ کہیں واردات ضرور کرتا!"

ایک آواز:۔ سرکار اکلا ہے۔ ساتھ ماں کو وُنا ہے۔

بڑے داروغہ:۔ ہاں بے ہاں اکلے ہی واردات بھی کیا کرتے ہیں۔ اکا دُکا راہگیروں کو لُوٹتے ہیں۔ سوتوں کے گھروں میں گھُستے ہیں۔ کہیں گیہوں چراتے ہیں۔ اور ایسا ڈاکو کہ سالے کے پاس چاقو تک نہیں۔ کیوں جی پہلے تو ہاتھ ہی کی توڑی بالیاں تھیں نا؟ ٹھیک سے دیکھا تھا؟ پہچان لیتے ہو ہاتھ کی توڑی؟"

ایک آواز:۔ ارے حجور ہم دیکھ کے بتائی دیں۔ کو و جناور نے کھائی، کوون ہنسیا کاٹی۔ ٹل سرکار یہ ہئی کوؤن ہرٹا۔

بڑے داروغہ:۔ کوئی بالکل نیا مجرم ہے۔ ضرور خون کر کے بھاگا ہے۔ ہو نہ ہو یہی مفرور قاتل ہے۔ کیا نام تھا جی؟ گشتی چٹھی پڑھی تھی۔ یاد ہے؟

ایک کانسٹبل کی بھاری آواز :۔ بہاری ولد جبابیر ساکن مگروان مقتول بلدیو سنگھ۔

ایک آواز :۔ داروغہ جی اتے نا ملے ہیے چاندر ماں۔ نہیں تو کھرے ماں ہوئی ہے اتے چلو۔

داروغہ جی :۔ ابے الّو کی دُم یہ ہم بھی جانتے ہیں۔ یہاں تو پیروں کے نشان دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور چاندر میں جاکر کیا چھ آدمی ڈھونڈھ لیں گے؟ پانچسو آدمی بھی ہوں تو نہیں ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ یہ تو گاؤں میں ہی پکڑا جائیگا۔ تھوڑے دن میں گھبرا کر ضرور کسی نہ کسی گاؤں میں جائے گا۔ تم لوگ خیال رکھنا جو پکڑ لائیگا یا اطلاع دے گا اُسے بہت انعام ملے گا۔

جان۔ جان۔ دُنیا بھر سے زیادہ پیاری جان۔ تیری حفاظت ہر طرح کی جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے اندھی لنگڑی بُڑھیا بسک بسک کر بھیک مانگتی ہے۔ جوانی کے وہ دن! عُشاق کے ہجوم، عیش و عشرت، روپیہ پیسہ، بال بچے، گھر بار سب رُخصت ہو گئے۔ کچھ نہ رہا۔ اب کیوں جی رہی ہے؟ کس کا انتظار ہے؟ گئے دن واپس آنے کی اُمید ہی نہیں۔ پھر کیوں جی رہی ہے؟ جان! سب سے پیاری جان باقی ہے۔ اس ہی کو گہرے داموں پالتی ہے۔

الوداع! اے انسانوں کی بستیوں الوداع! بہاری اب کبھی تمہاری طرف رُخ نہ کرے گا!

انسانی رہ گذر سے کوسوں دور گھنی سبز اور شاداب جھاڑیوں اور طرح طرح کی فرنوں سے ڈھکا چوکا ڈھایا ڈھلوان اُترتا ہوا اپنے میں ٹھنڈی سبز بیت کی جھاڑیاں شامل کر لیتا ہے تو پھر یہاں انتہائی گھنا پندرہ فٹ اُونچا نرکل کا تختہ بس سے آملتا ہے۔ جب تمام جنگل سوکھ جاتا ہے اور ہر طرف آگیں لگی ہوتی ہیں تو یہاں مہکتے ہوئے پھولوں میں صدہا چڑیاں جھولا جھولتی ہیں اور قدرت کے

راگ گاتی ہیں۔ اسی نرکل میں ایک جگہ سے چھچانڈی چھچانڈی بُو آتی ہے۔ تر زمین پر نازک نرکل بچھا کر شیر اور شیرنی نے تھوڑی سی جگہ بنالی ہے۔ اور اس ٹھنڈے اور روشنی سے محفوظ گھر میں شیرنی نے بچے دئے ہیں۔ جن کو وہ لیٹی ہوئی بڑے عز و رسے دیکھ رہی ہے۔ اس کی پُشت پر شیر غافل پڑا سو رہا ہے۔ بچوں کی آنکھیں کُھل چکی ہیں۔ وہ آپس میں کھیل رہے ہیں۔ سُنہرے بدن پر ہلکی دھاریاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ شام ہوگئی ہے۔ شیرنی کو انتظار ہے کہ کب اس کا سرتاج شیر اُٹھے اور کب وہ ڈھائے سے اوپر سانپ لائن[1] سے کچھ دور روہنی[2] کی جھاڑیوں میں جائے جہاں کل کا بچا ہوا آدھا سانبھر اب بھی پڑا ہے۔ شیر انگڑائی لے کر لیٹے سے سر اُٹھا کر اس کو اور بچوں کو دیکھتا ہے۔ شیرنی فوراً بدن کو جھکولا دیکر کھڑی ہو جاتی ہے گول مٹول بھورے بھورے دونوں بچے جو اُس کے اوپر سوار ایک دوسرے پر داؤں لگا رہے ہیں لُدلُد زمین پر گر کر لُڑھک جاتے ہیں۔ جیسے ہی شیر اُٹھ کر بیٹھتا ہے شیرنی نرکلوں میں آمد ورفت سے بنی ہوئی گلی کا رُخ کرتی ہے۔ شیرنی چونکہ دودھ پلا رہی ہے اس کی اشتہا بڑھی ہوئی ہے۔ وہ بھوکی ہو رہی ہے۔ آخر شیر بھی روانہ ہوگیا۔ جب نرکلوں سے باہر آ گیا تو اس نے ایک لمبی چوڑی انگڑائی پھر لی۔ اور شیرنی کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چل دیا۔ بید کی جھاڑیوں سے نکل کر جونہی یہ دونوں سانپ لائن پر آئے ایک ساکھو کی ساٹھ فٹ کی بلندی سے مور نے می اوں، می اوں، کے نعرے لگائے۔ ہلدو کے درخت پر بیسیوں بندروں کی کٹکٹی بندھ گئی۔ ان دونوں کو آج شکار تو مارنا

---

[1] سانپ لائن وہ سڑک ہے جو ڈھائے کی آدھی اونچائی پر کاٹی گئی ہے۔ چونکہ ڈھایا ٹیڑھا بیڑا ہے اس لئے یہ سڑک بھی سانپ کی طرح لہرائی ہوئی ہے۔ سڑک سے کہیں بھی ۹ فٹ سڑک کی طرح نہیں ہے بلکہ صرف ایک راستہ ہے جس پر سے درخت کاٹ دیئے گئے ہیں۔

[2] ایک جھاڑی جس کے پھولوں میں سے سُرخ رنگ کی ایک دوا نکلتی ہے۔ نہ معلوم یہ دوا کس کام آتی ہے۔ پہاڑی اسے جمع کرتے ہیں۔

نہ تھا۔ چھپ کر پھرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے نکلنے کی اگر جنگل کو اطلاع ہو گئی تو ہو جائے۔ اطمینان سے کھلم کھلا سانپ لائن پر چلتے رہے۔ اور جب رونہی کے جنگل کے نیچے پہنچ گئے تو باری باری ایک ایک جست لگا کر ڈھلائے پر چڑھ گئے۔ اور رونہی میں تھوڑی دور چل کر سانبھر کی بچی کھچی ٹھٹھری پر پہنچے۔ لیکن یہاں آتے ہی دونوں کے شاہانہ سکوت اور اطمینان میں قہر اور غصہ کا تغیر پیدا ہو گیا۔ شیر غضب ناک ہونے لگا۔ اس کی نرم و نازک لچکتی ہوئی ملکہ خونخوار جھنجلائی ہوئی شیرنی ہو گئی ——— گوشت چرایا گیا ہے ——— انسان کی بُو آ رہی ہے ——— شیر کی سیدھی دم کی نوک دائیں اور بائیں لہرا لہرا کر طبیعت کے انتشار کو ظاہر کرنے لگی۔ شیرنی کو غصہ زیادہ تھا۔ ناگن کی سی دو پھنکاریوں کی سی آوازیں اس کے منہ سے نکلیں۔ وہ سانبھر کی بچی ہوئی کھال اور ہڈیوں کو سونگھتی ہوئی اس کے چاروں طرف گھومی۔ پھر ایک طرف روانہ ہو گئی۔ آج وہ ضرور اس موذی چور سے بدلہ لے گی۔ یہ تیسری بار ہے کہ اس کا شکار چوری ہوا ہے۔ شیر بھی اس کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا۔ لیکن اب اس پر پھر وہی فطرتی متانت آ گئی تھی۔ وہ بڑھ کر شیرنی کے آگے ہو لیا۔ جاتے جاتے تین فرلانگ کے بعد جیسے ہی کنارے کی گھنی پتاور سے کھلی ہوئی فائر لائن پر شیر نے باہر سر نکالا دو سو قدم پر سامنے بھاگتا ہوا انسان نظر آیا۔ شیر آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم پڑا۔ اور اسی طرف کٹتا ہوا شیرنی کو نہر کی پٹڑی پر نکال لے گیا۔

اگر کوئی چیز انسانی دماغ پر ایک ہی وقت میں دو متضاد اثرات پیدا کر سکتی ہے تو ترائی کے جنگلوں ہی میں۔ جنھوں نے خود ان جنگلوں کی سیر نہیں کی ہے وہ مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ شام کے وقت چوکا ندی کے ڈھائے کے کنارے کسی

۱جنگل کے تمام جانور انسان سے اس قدر ڈرتے ہیں گویا انسان کا مارنا ان کو حرام ہے۔

فائر لائن پر کھڑے ہو تو دونوں طرف کے اونچے سال کے جنگلوں میں لاکھوں قدآور درختوں کے تنے ہی تنے اوپر کے سبز پتّوں سے بنی ہوئی چھت کے اندھیرے میں نگاہ سے اوجھل پڑتے پڑتے غائب ہو جاتے ہیں۔ ڈھلائی کی طرف صدہا جھاڑیاں ان پر بیلیں اور دھانی رنگ کے نازک پودوں کے بعد ہری کچی بیت کی بیلوں سے بنی ہوئی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی نگاہ نرکل کے لہلہاتے تختے پر میلوں جاکر دُھندلی پڑتے پڑتے کسی دور دراز جنگل میں مل جاتی ہے۔ جو کہ فاصلہ کی وجہ سے دُھندلا غبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جنگل میں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہوتی ہے۔ دفعتہً ایک مُرغی کڑکڑاتی ہے اور اس کے بعد ہی مور چلاتا "می آؤں، می آؤں" اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ سین ایک ہی وقت میں انتہائی دلفریب بھی معلوم ہوتا ہے اور انتہائی بھیانک بھی۔ انسان خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگنا بھی چاہتا ہے اور ہٹنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک ہے جب تک دن کی روشنی پوری طرح موجود ہے۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا ہے اس کی دلفریبی بھیانک پن میں بدلتی جاتی ہے۔ جوں جوں شام ہوتی ہے دل کی حرکت تیز ہوتی ہے اور جھٹپٹے کے وقت دیکھنے والے کو یہ جنگل موت کا بھیانک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ درخت اور جھاڑیاں سیاہ کمل اوڑھ کر منحوس شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس وقت سیر کرنے والے کا دل روشنی اور انسانی صحبت کے واسطے تڑپتا ہے۔ وہ جلد جنگل سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ اور جب ایک دفعہ پھر وہ لیمپ کی روشنی میں اپنے ہم جنسوں میں جا بیٹھتا ہے تو اس کا دل خود بخود خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

لیکن صرف چار مہینے کے قلیل عرصے میں پیاری جان کی حفاظت کا جذبہ بہاری کے دماغ کو ان احساسات سے معطل کر چکا ہے۔ انسانی خیالات اور محسوسات ساکت ہو چلے ہیں۔ ان کے بجائے خالص حیوانیت ترقی کر رہی ہے۔ سر اور داڑھی کے خود رو پریشان بالوں سے گھرا ہوا چہرہ انسان کے چہرے

سے بہت کچھ جدا معلوم ہوتا ہے۔ کمر سے گھٹنوں تک اب بھی کپڑے کی چند لیریں لٹکی ہوئی ہیں۔ حرکات میں وحشت، چال میں چیتے کی سی جھپک! اور آنکھوں میں ہرن کا سا چوکنا پن ہے۔ اب وہ بیٹھ کر بجائے اپنی بدقسمتی کے واقعات سوچنے کے جنگل کی آوازوں پر کان لگا کر ان کے مطلب اخذ کرتا ہے۔ جنگل کی جڑوں اور پتوں سے بڑھ کر پرندوں کے انڈے! بسیرا لیتے پرندے، مرے گرے جانور! اور دوسروں کا مارا شکار کھاتا ہے۔

ایک دن حسبِ دستور جب موروں نے کوک کر! میناؤں نے شور مچا کر اور بید کی رہنے والی مرغیوں نے کڑکڑا کر اطلاع کر دی تھی کہ جنگل کا بادشاہ اور اس کی ملکہ رات کے کاروبار سے فراغت کر کے دن بھر سونے کے واسطے نرکلوں میں گھس گئے ہیں۔ اور جب بندروں نے بھی درختوں سے اترنا شروع کیا تو بہاری بھی درخت سے اُترا۔ رات کو سانبھروں کے بے تحاشا بھاگنے۔ چیتلوں کے "پوق پوق" چلانے کے بعد چوکا کی طرف شیر کے فتحمندانہ گرجنے کی آوازیں سُن چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج پھر تازہ شکار مارا گیا ہے۔

اب اس کے واسطے یہی تھا کہ شام ہونے سے پہلے اس شکار کو ڈھونڈھ لے جس کو کہ شیر اور شیرنی نے انتہائی کمال سے کہیں چھپا دیا ہوگا۔ بہاری اس کی تلاش میں روانہ ہوا لیکن ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے دن ڈھل گیا۔ یہ نا اُمید ہو کر اس جستجو کو دوسرے دن کے واسطے ملتوی کرنے ہی کو تھا کہ شکار کی گھسیٹنی پر اس کی نگاہ پڑ گئی۔ فوراً بہاری نشان پر روانہ ہوا۔ نرکلوں سے آدھ میل جنوب کی طرف سانپ لائن پر سے ہو کر جہاں نرکل ختم ہو کر پانی اور کیچڑ میں گھنا پیڑ اکھڑا تھا یہ جا پہونچا۔ اب گوشت کچھ دور نہ تھا ضرور اسی پیڑ میں ہوگا۔ ایک کوا ابھی وہاں بیٹھا تھا۔ لیکن شام ہو چلی تھی۔ وہاں جانا مخدوش تھا۔ شیر کے نکلنے کا وقت آ گیا تھا۔ مگر بہاری کو تین دن کا فاقہ ہو چکا تھا۔ اس نے ہمت کی کہ جلدی سے

تھوڑا گوشت کاٹ لائے۔ پانی میں چھپ چھپاتا پیڑے کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا تیزی سے بڑھا، پتّوں سے ڈھکے سانبھر تک پہنچا تھا کہ دُور مور چلّایا۔ مرغیاں کڑکڑائیں۔ بہاری سانبھر پر جُھکا ہوا تھا۔ تین سکنڈ کے واسطے ٹھٹک گیا۔ لیکن فوراً ہی اس نے ارادہ کیا کہ ایک ہی ٹکڑا کاٹ لے۔ کھال اور چری ہوئی سانبھر کی لاش پر ایک ہی وقت میں ایک جگہ دونوں ہاتھ ہنسیا سے گوشت کاٹنے میں لگ گئے۔ اور دوسری جگہ اس کے دانت کچے گوشت میں مصروف ہو گئے۔ دو لقمے پیٹ میں اور سیر بھر کا ٹکڑا ہاتھ میں لیکر بہاری بھاگا۔ پیڑے سے نکل، جھاڑیوں میں سے ہو کر جس وقت وہ سانپ لائن پر آیا تو وہیں شیرنی کھڑی تھی۔ خاموش بجلی سی کوندی۔ چار من کا شیرنی کا جسم ایک ہی چھلانگ میں بھاگتے ہوئے بہاری پر گرا۔ کمر اور پسلیاں سیٹوں کی طرح چرچراتی چلی گئیں۔ بہاری شیرنی کے اگلے پیروں کے نیچے ایسا پڑا تھا جیسے کھونٹی سے گری ہوئی اچکن پڑی ہو۔

شیر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ان واقعات سے بے خبر ٹہلتا ہوا جیسے ہی قریب آیا ٹھٹک کر رُک گیا۔ شیرنی نے لاش کو اس طرح مُنہ میں اٹھا لیا جیسے بلّی نیم مردہ چوہے کو۔ اور جھٹکے دینے لگی۔ شیر کے منہ سے گھٹی ہوئی غراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ بہاری کے زمین پر گھسٹتے ہوئے پیر اور لٹکتے ہوئے ہاتھ ہلتے دیکھ کر خوف سے شیر کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ شیر انسان سے نہ ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین[1] اس طرح شکن ہوتے دیکھ کر تھرّا گیا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور "خوں، خوں، خوں، خوں" غُرّاتا ہوا شیرنی کو ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ڈھائے سے اُتر کر پیڑے اور اس کے بعد کلک کے جنگل میں سے نکلتا ہوا چوکا کو تیر کر نیپال کی طرف نکل گیا۔

---

[1] جو لوگ جنگلوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس کس طرح شیر اور ہاتھی تک انسان کو چھوڑ چھوڑ کر کترا جاتے ہیں۔

انسان کے گوشت اور خون میں ایک عجیب صفت ہوتی ہے۔ جس طرح کتے کے کاٹے سے انسان بورایا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح درندے انسان کے گوشت سے بورا جاتے ہیں۔ پھر ان کو ہر وقت انسان ہی کی جستجو رہتی ہے۔ شیرنی کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بَن رکھے اور دو گاڑی والوں کو مارنے کے بعد جب اس کو اور آدمی چوکاڈھایا کی طرف نہ ملے تو اپنے بچوں سمیت وہ نہر پار کر کے گھومتی گھومتی مزروعہ زمین اور گاؤں سے ملے مینا کوٹ کی زمینداری جنگل میں آ گئی۔ یہاں آکر اس نے متواتر کئی خون کئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن دوپہر کے وقت ہاکار کے طرح طرح کی آوازوں سے ڈرا کر اسے نئے اُگے چاندر سے نکالا۔ دونوں چھوٹے بچے ساتھ تھے جن کی وجہ سے یہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ جوں ہی یہ بچوں کو لئے چاندر سے نکلی سامنے درختوں پر بندھے ہوئے مچانوں سے تڑاتڑ بندوق کے فیر ہوئے۔ دو گولیاں اس کے لگیں اور ایک اس کے بچے کے۔ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ محمود کی گولی گردن پر اور احمد میاں کی پاکھے پر کبھی خطا ہی نہیں ہوئی۔ دوسرا بچہ پھر چاندر میں گھس گیا جو کہ کمبل اور کپڑے ڈال کر زندہ ہی پکڑ لیا گیا۔

آج اس واقعہ کو برسوں گذر گئے ہیں۔ اب بھی کہیں ایک سفید بڈھا لکڑی ٹیکے ٹیکے پھر کر زندگی کے کاروبار بھی کرتا ہے اور دن میں کئی دفعہ لکڑی کے سہارے بیٹھ کر اپنے اکلوتے بیٹے بلدیو سنگھ کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے اور کہتا ہے " اسے

• ایک دفعہ مجھے ایک چاندر میں تازہ مرا ہوا سانبھر ملا۔ سینگ بہت اچھے تھے۔ میں اور میرا ملازم سر کاٹنے کے واسطے اس پر جھکے۔ آٹھ نو فٹ کے فاصلہ سے شیر نے غرّا کر ڈانٹا۔ اور حملہ اب بھی نہ کیا۔ اصلیت یہ ہے کہ دہلی اور بمبئی کی سڑکوں سے کہیں زیادہ محفوظ جنگل میں پھرنا ہوتا ہے۔

بھگوان میں نے کونوں پاپ کئے تھے جو مجھے یہ سزا ملی" اور اب بھی کہیں ایک گیارہ فٹ لمبا شاندار شیر اپنے لاغر جسم کو لچکاتا ہوا گھنٹوں کٹہرے کی سلاخوں کے آگے گھومتا ہے۔ اور جب سلاخوں میں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو بیٹھ کر کسی دُور دراز خیال میں غرق ہو جاتا ہے۔ تماشائی تالیاں بھی بجاتے ہیں کنکریاں بھی پھینکتے ہیں مگر اس کو خبر نہیں ہوتی۔ وہ کسی گہرے خیال میں ہوتا ہے۔

شیر کیا سوچتا ہوگا؟ ....

یارب! یہ دُنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے؟

کلوا

منہ پر پسینہ، گالوں پر سرخی، کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے۔ قمیص کے دامن اور ہاتھ پر روشنائی کے دھبے، ازار بند پیروں تک لٹکا ہوا، ایک بغل میں کالا بستہ اور دوسری بغل میں کالا کتے کا پلا، منّن گھر میں داخل ہوا۔ امّاں نے چیخ ماری "ہے ہے میں مرگئی" سنگر مشین نے گنگنانا بند کر دیا۔ ماں کا ایک ہاتھ مشین کے ہینڈل پر تھا دوسرا ماتھے پر! وہ ساکت بچے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اور گہری محبت نمایاں تھی۔ لڑکے نے چھوٹے سے گھر میں ایک طرف سے دوسری طرف گردن گھما کر دیکھا، اور بھاری آواز بنا کر بولا "اماں ہم اسے پالیں گے"

ماں نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر پلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے خدا کیلئے گود سے تو پھینکو" کچھ خفگی کی آواز میں "سارے کپڑے نجس کر لئے پھینکو اسے۔ تمہارے ابا آتے ہوں گے"

لڑکے نے جلدی سے پلے کو زمین پر رکھ دیا۔ پلا تین انچ کی دُم ہلا ہلا کر منّن کے جوتوں پر لوٹنے لگا۔ ماما نے باورچی خانہ سے گردن باہر نکال کر ناک پر انگلی رکھ کر ہنستے ہوئے کہا "بوی دیکھئے تو موا کیسا پیروں میں لوٹ رہا ہے" دو برس کی لڑکی تخت کے پاس سے صحن کی طرف بڑھی۔ ماں چلائی "لو یہ بھی چلیں، اب گھر گندا ہوگا۔ منّن تم یہ کیا مصیبت لے آئے!"

منّن نے کہا: "بٹو کاٹ کھائے گا ادھر نہ آنا"

ڈیڑھ گھنٹے بعد منّن مُنہ دھوئے، صاف کپڑے پہنے، اُجلے بنے، چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صرف سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر ہلکے نیلی روشنائی کے نشان ابھی تھے۔ سامنے مُرادآبادی تھالی میں دو بسکٹ تین جلیبیاں اور ایک پیالی دودھ تھا۔ جس پر تین مکھیاں مشغول تھیں۔ خود کتّے کی طرف مشغول تھے۔ کتّے کا پلّا صحن کو دروازے کے سامنے کھٹولے کے پائے میں دھجّی سے بندھا ہوا ایک ہڈّی میں پوری طرح مشغول تھا۔ ماں نے توریاں چھیلتے ہوئے کہا: "اب ناشتہ کرلو یہی تو بات بُری ہے۔ مکھیاں بھنکار رہے ہو۔ دیکھو دودھ میں مکھّی گرجائیگی۔"

"امّاں اس سے ہڈی چبتی تو ہے نہیں۔ بسکٹ دیدوں" یہ کہا اور لڑکا بسکٹ لیکر اُٹھنے لگا۔

ماں نے کہا: "چلے پھر چھونے کو۔ ارے تم کھا تو لو، ہیں اور ..."

گھر میں آہستہ سے مالکِ خانہ داخل ہوئے۔ سیاہ ٹوپی، سیاہ فریم کی عینک، سیاہ نکیلی داڑھی۔ سیاہ شیروانی۔ سیاہ چھڑی ہاتھ میں اور سیاہ جوتہ پیر میں۔ کھٹولے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ بیوی سجی ہوئی چائے کی ٹرے میں سے چائے دان لیکر باورچی خانہ کی طرف چلیں۔ لڑکا وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر دودھ میں بسکٹ توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ میاں نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا: "یہ کیا ہے جی؟ کون لایا اسے؟"

بیوی چائے دان ہاتھ میں لئے باورچی خانے کے سامنے رُک گئیں مُسکرا کر بولیں: "اے موا ڈیوڑھی میں آگیا تھا۔ کوں کوں کر رہا تھا۔ دیکھ کر ترس آگیا۔ کیا پیارا ہے۔ میں نے باندھ لیا"

میاں نے لاحول کو قرأت سے ادا کرکے کہا: "بھگے گا تو؟"

"بھنگن اُٹھائیگی"

"موتے گا جو؟"

"تو لوٹے سے دھویا جائیگا۔ آؤ چائے پی لو۔"

"بچے جو چھوئیں گے؟"

بیوی اب باورچی خانہ میں تھیں اس لئے کوئی جواب نہ ملا۔ متن کا سر البتہ پیالے کی طرف اور جھک گیا۔ میاں نے کمرے میں جاکر اپنے سوا باقی تمام چیزیں ایک ہی کھونٹی پر لٹکادیں۔ دوسرا قمیص اور پاجامہ پہن کو منہ دھویا۔ تولیہ سے رگڑ رگڑ کر داڑھی کو پونچھا۔ اور چائے پینے کو بیٹھ گئے۔ بیوی پاس بیٹھ کر مکھیاں جھلنے لگیں۔

اب پھر میاں بولے: "کیا نجاست پھیلائی ہے پھکوا دو باہر!"

بیوی نے بگڑ کر کہا: "بس تم کو تو ایک بات کی دھن ہو جاتی ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔ پڑا ہے بچے کھیلیں گے!"

"ہاں یہ انھی حضرت کا شوق ہوگا؟"

حضرت تینوں جلیبیاں، آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا دودھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے زینے میں گھس، چھت پر پہنچ گئے۔

کالا پلّا آٹھ دن اس گھر میں مہمان رہا۔ دو دن صحن میں جہاں دو دفعہ میاں نے گود والی لڑکی کو اسے چھوتے دیکھا۔ پھر پانچ دن ڈیوڑھی میں، جہاں ایک دفعہ اس کی رسّی پیروں میں پھنسی اور دوسری دفعہ یہ خود اُن کے پیروں میں آگیا۔ آخری یعنی آٹھویں رات اس کو کوٹھے پر بسر کرنی پڑی۔ یہاں اس کو ماں کی یاد نے ستایا۔ یہ یادِ ماضی پر چیخیں مارتا رہا اور میاں بیوی کو جھنبوڑتے رہے۔ اوپر اور نیچے دونوں جگہ رت جگا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کالا پلّا صدائے احتجاج بلند کرتا رحیمن بوا (ماما) کے پیچھے گھسٹتا ہوا نخاس کی چوڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ اور سڑک کے سپرد کر دیا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک موٹر نے غیں! غیں! کرنا شروع کی۔ ایک بڑے لڑکے نے ہنستے ہوئے لپک کر اُسے ایسی ٹھوکر ماری کہ یہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا پکی نالی میں جا گرا۔ موٹر ایک دفعہ اور غیں کر کے چل دیا۔ لیکن کالا پلّا عرصے تک ٹیاؤں!

ٹیاؤں کرتا رہا۔

نالی میں کیچڑ اور پانی صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے پنجے ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن نالی اس کے واسطے کافی گہری تھی۔ جس میں سے وہ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے چار چھ زبان کے سڑاپوں سے کچھ پانی پیا۔ اور پھر نالی پر چڑھنے کو اگلے پیر اٹھا کر نالی کی دیوار پر رکھے۔ تین دفعہ کوں کوں کی اور پھر پیر نیچے کر کے چل دیا۔ آٹھ قدم چل کر پھر اس نے وہی کوشش کی اور کوں کوں کر کے پھر چل دیا۔ گلے کی رسّی پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی کوششیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک قصائی کے لڑکے کی اس پر نگاہ پڑی۔ ایک ہاتھ میں بستہ اور بغل میں تختی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں مٹی کی دوات اور سینٹے کا قلم۔ صرف پیر آزاد تھے۔ چنانچہ اس نے ننگا پیر لٹکا کر اس کی مدد کرنا شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں پلا کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اتنے میں قصائیوں کے دو لڑکے اور آ گئے۔ کچھ دیر وہ اس کا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر اُن میں سے ایک نے جھک کر اس کی رسّی کا سرا پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اور اس کی رسّی کو نالی کے باہر نکال دیا۔ رسّی پر لپٹی ہوئی کیچڑ کے چھینٹے اڑے۔ ایک کی آنکھ میں اور دوسرے کے کھلے ہوئے ہنستے مُنہ میں کیچڑ نے اپنا مزا چکھایا۔ چنانچہ تینوں لڑکوں میں آپس میں ماں اور بہنوں کے متعلق شستہ گفتگو شروع ہو گئی۔ کالے پلّے نے محبّت بھری نگاہوں سے اُس لڑکے کو دیکھا جو جھکا ہوا اپنے ہاتھ کی کیچڑ سڑک پر پھینک رہا تھا اور اپنے ساتھی کی گالی کے جواب میں گالی برابر لوٹا رہا تھا۔ پلّا دُم ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ اب اس نے پلّے کو غور سے دیکھ کر کہا "شیرا ہے شیرا" پھر اس نے رسّی کے سرے کو پیر سے زمین پر رگڑا اور اٹھا لیا "آ و شیرا آ و!" کر کے رسّی تانی شیرا نے تین چار پھدکیاں اس کی طرف بھریں۔ اب لڑکا بھاگنے لگا۔ دو چار قدم شیرا نے ساتھ دیا پھر گھسٹنے لگا۔ جب پیر چلنے لگے تو پیں پیں کر کے چت ہو کر ہی گھسٹنا بہتر سمجھا۔ باقی دونوں لڑکے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ گلی کے نکڑ پر مونڈا بچھائے پہلوان

بیٹھے تھے۔ انھوں نے لونڈوں کو ڈانٹ بتائی: "ارے تمہارا ایسا ویسا لونڈو کیا کرتے ہو۔ چھوڑ دو پلے کو۔" لونڈے پلے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پلا تین انچ کی دُم ٹانگوں میں دبائے سر زمین سے لگائے پہلوان کی طرف بڑھا۔ پہلوان نے پیر سے دو تین دفعہ اسے لُڑھکا کے گلی کے اندر کر دیا۔ اور خود بے فکر ہو کر پھر مونڈھے پر جا بیٹھے۔ وہیں پر چار دو کانوں میں کہار رہتے تھے۔ ایک کہاری بیٹھی لوہے کی کڑھائی مانجھ رہی تھی۔ پلا اس کے پاس اسی حالت سے سر زمین سے ملا، دُم پیروں کے اندر، کوں کوں کرتا گیا۔ کہاری نے کہا: "دھو، دھو۔"

ایک تیرہ برس کی دُبلی میلی کہار کی لونڈیا نے برابر کی دوکان سے چھلانگ ماری اور پلے کو اُٹھا لیا۔ لیکن فوراً ہی رام رام کہہ کر زمین پر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر رگڑ کر دوکان میں گئی۔ ایک لٹیا پانی لائی اور اسے غسل دیا۔ پلے کا یہ پہلا غسل تھا۔ بہت ناپسند آیا۔ ہر طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ناک میں بھی پانی چلا گیا۔ بُری طرح چھینکیں آئیں۔ جب غُسل ہو چکا تو وہ کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا بدن ایک میلے چیتھڑے سے پونچھا۔ مٹھے میں بجور کر جھڑے کی روٹی کھانے کو دی۔ اسی لڑکی نے اس کا نام کلوا رکھا۔ لڑکی کا خود نام چندو تھا۔

کلوا نے ڈھائی مہینے چندو کے ہاتھ اور پیر چاٹے۔ اس کا یہ زمانہ بڑے عیش میں کٹا۔ لیکن اسی قلیل عرصے میں بھوریا نامی قصائی کے لڑکے نے پہلے تو چندو سے تعشق بڑھایا۔ لیکن جب چندو نے ایک دو مرتبہ بُری طرح جھڑک دیا تو پھر اس نے بَیر بڑھایا۔ اور اب بھی جب بس نہ چلا تو ایک رات جب یہ لوگ گلی میں سو رہے تھے تو کلوا کو کھٹیا کے پاس سے اُٹھا بھاگ گیا۔ پہلے کلوا نے کوں کوں کی پھر ناراضگی کے دانت دکھائے اور آخر میں جب کاٹنے کی کوشش کی تو بیچارے کی تھوتنی پکڑ لی گئی۔ بھوریا نے اسے بہت دور بلوچپورہ کے ایک پرانے قبرستان میں لیجا کر قبروں کے بیچ میں ایک بیری سے باندھ دیا۔

کلوا تمام رات سینکڑوں قبروں پر اکیلا نوحہ خوانی کرتا رہا۔ صبح کو ایک لونڈا زمین سے صرف چار انچ اونچا کرتہ پہنے قبروں میں کچھ ڈھونڈتا ہوا آیا۔ کلوا کو دیکھ کر بڑے زور سے چلایا "بابا رے یہ دھرا سالا" بابا، قبرستان کے تکیہ دار فقیر، مہندی کی قینچی ہاتھ میں لئے آئے اور کلوا کی بہن کو یاد کر کے بولے "رات بھر چلایا کیا" اور مہندی کی قینچی سے کلوا کو ٹھکنا شروع کر دیا۔ لمبے کرتہ والا لڑکا کلوا کی واویلا سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنسی کے مارے لوٹا جائے۔ یہاں کلوا کی یہ حالت کہ جب پیٹھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی تو چت ہو گیا۔ اور پیروں پر قینچیوں کو روکنے لگا۔ خدا خدا کر کے قینچی ٹوٹی تو اس کی جان بچی۔

کلوا دن بھر اسی بیری کے نیچے بھوکا پیاسا بندھا ہوا چندو کی یاد میں پڑا رہا۔ دن بھر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دور کچھ عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آیا کیں۔ لیکن اس طرف ایک قبے کے لمبے چوڑے تکیہ نے آڑ کر رکھی تھی۔ شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو اسی طرف سے کلوا کی تیز ناک نے بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ صبر پر جبر نہ ہو سکا۔ ایک مہین اور لمبی چیخ نکل گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد ایک عورت اس کے پاس آئی تو کلوا ڈر کے مارے چت لیٹ گیا۔ دُم پیروں میں سکیڑلی۔ زبان گو پیاس سے لٹکی پڑتی تھی لیکن جلدی جلدی اندر سمیٹ کر ہلکے ہلکے کوں کوں کرنے لگا۔ عورت نے اسے کھولا اور لے چلی۔ کلوا خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ قبرستان کے دوسرے سرے پر دو مختلف قسم کے مکان تھے۔ ایک کوٹھری اور ایک مقبرہ۔ ان ہی دونوں میں ان لوگوں کی رہائش تھی۔

وہاں ایک بکری بندھی تھی۔ چارکھٹیاں ایک لائن میں پڑی تھیں۔ ایک عورت اور چھ بچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گیسو دراز فقیر صاحب مقبرہ کے چبوترے پر اکڑوں بیٹھے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ کلوا نے ہانپتی ہوئی زبان اندر کر کے گانجے کی خوشبو پر غور کیا۔ غالباً بری معلوم ہوئی۔ ناک کی نوک کو ایک دفعہ دائیں اور پھر بائیں طرف جنبش دیکر زبان پھر لٹکا دی اور ہانپنے لگا۔ عورت نے اس کو بھی

اسی کھونٹی سے باندھ دیا جس سے کہ بکری بندھی تھی۔ اس نے جاتے ہی بکری کے کونڈے میں سے پانی چاٹا۔ بکری کو اس دوہری ہتک عزت پر غصہ آ گیا۔ اس نے تین چار دفعہ کھریاں جوڑ کر اور سینگ کی نوکیں کلوا کی طرف کر کے حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن کلوا نے ظاہراً اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اطمینان سے دونوں اگلے پیر آگے پھیلا کر اور پچھلے سمیٹ کر۔ اس چٹائی کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب اس چٹائی پر کھانا ہونے لگا تو اس کی ہم کھوٹا بکری نے بھی جگالی شروع کر دی۔ پہلی بوٹی جب کلوا کے پاس آ کر گری تو اس نے اپنی دُم کو شکریہ کے واسطے دو دفعہ زمین پر مارا۔ تہذیب سے وہیں پر بیٹھے بیٹھے گردن لمبی کر کے سر بڑھا کر بوٹی کو اُٹھا لیا۔ چونکہ مزے دار تھی دو ہی دانت مار کر نگل لی۔ زبان سے ناک اور ہونٹوں کو چاٹ کر صاف کر لیا۔ اور پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری بوٹی ہوا میں اُڑی۔ ان کے پھیلے ہوئے پیروں کے بیچ میں گردن کے نیچے آ کر رُک گئی۔ دُم کو تین جھٹکے شکریہ کے دیکر کلوا کھڑا ہو گیا۔ بوٹی نرم تھی، ویسے ہی نگل گیا۔ پھر جو ایک ہڈی اُچھلی تو بکری کے پاس گری، یہ جو اس طرف بڑھا تو بکری چونک پڑی۔ چابن نگل کر جگالی کے نئے غلّہ کے گردن میں سے چل کر مُنہ میں آنے کے انتظار میں تھی، کوئی بھلا جانور ایسے موقعے پر دخل اندازی پسند نہیں کر سکتا۔ فوراً سر نیچا کر کے سینگوں کی نوکیں پیش کر، کھریاں جوڑ حملہ آور ہوئی۔ معاملہ ہڈی کا تھا معمولی بات نہ تھی۔ کلوا نے بھی جواب دیا "ہڈی" اور پھر "ہم ہم" کر کے دو جھوٹے جھلے گئے۔ بکری صاحبہ ڈر گئیں۔ اب جو بھاگیں تو رسّی کو بھی بھول گئیں۔ بس بھاگ پڑیں۔ رسّی تنی جھٹکا کھایا۔ دھم سے زمین پر دراز ہو گئیں۔ کلوا کی جانے بلا۔ ہڈی اٹھا دوسری طرف چل دیئے۔ جب رسّی تن گئی بیٹھ کر مزے لینے لگے۔ گیسو دراز صاحب نے اٹھ کر ایک رسّی کے ٹکڑے سے کلوا کو بڑی مار ماری۔

سات دن کلوا کو قبرستان میں پیٹ بھر مار اور آدھے پیٹ کھانے پر گذر گئی

پڑی۔ ایک رات خیال آیا کہ اگر دانتوں کو رسی پر ورزش دی جائے تو کیا ہرج ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ کلو آزاد تھے۔

غلامی کا نشان صرف فٹ بھر کا ٹکڑا گلے میں باقی تھا۔ اس کی فکر کلو کو مطلق نہ ہوئی۔ فوراً ایک طرف روانہ ہو گیا۔ چندو کی یاد اور پیٹ کی خواہش ان دو اثرات کے تابع اس کے قدم اٹھنے لگے۔ نیم کا سایہ، نیم کی جڑ، تین کچی قبریں، دو پکی قبریں۔ ایک بہت اونچی پکی قبر۔ وہی پت جھڑی بیری، دو دھنسی قبریں، ایک چھوٹی قبر۔ اس کے برابر ایک بڑی قبر۔ ایک قبر کا خالی گڑھا، قبرستان کی دیوار کا ایک گرا ہوا حصہ۔ سب کو دم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف کئے ہوئے پار کیا۔ دوسری طرف دیوار سے ملا ایک نیولا کھڑا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا اور لپکا۔ اس نے اسے دیکھا اور بھاگا۔ چار چھلانگوں میں یہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولا پلٹ پڑا۔ دم پھول کر جھاڑو ہو گئی۔ پچھلے پیروں پر بیٹھ کر مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ کلو بھی اگلے دونوں پیر چھوڑ کر بدن کو پیچھے تان کر رک گئے۔ اب غالباً اشاروں میں ایک نے دوسرے سے معافی مانگی۔ وہ ادھر چل دیا اور یہ ادھر روانہ ہو گئے۔ پھر وہی دم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف۔ چندو یا غذا دونوں میں سے ایک جس کی بو مل جائے۔

جاتے جاتے پکی سڑک پر ہو لیا۔ عیش باغ کے سامنے پولس کی چوکی پر پہونچا۔ ایک موٹے کتے نے لیٹے لیٹے "غر" کر کہا: "ہوں!" کلو نے دم دبائی اور ایک سپاٹا بھرا۔ ایسے ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ہڈی کی بو پائی۔ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ناک زمین پر سوں سوں کر کے فوراً ڈھونڈھ لی۔ دیکھا تو کچھ حصہ اس میں کام کا تھا۔ کھایا اور پھر چل دیا۔ آرٹ کے۔ ریلوے کی چوکی آگئی۔ ایک بوچے کتے نے لپک کر ان کا راستہ روکا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے کھڑے ہو کر کھیسیں دکھا بُردباری سے کھینچ کر کہا: "کھیں!" کلو نے بھی کچلیاں دکھا کر کہا: "کھیں!" بوچے نے اور گہری آواز گلے سے نکال کر کہا: "دیکھیں!" کلو نے دانت نکال کر تین دفعہ جھٹکوں سے منہ بنا کر کہا: "ہیں۔"

ہیں۔ ہیں "۔ ایک کُتیا اور آگئی۔ اس نے آتے ہی کلوا کو باری باری دونوں سروں سے سونگھا، اور پھر بے پرواہی سے انھیں چھوڑ کر چل دی۔ جس کے صاف معنی اس کی زبان میں یہ تھے "جانے بھی دو لونڈا ہے "۔ مگر بگڑے دل بوچے کو کب گوارا تھا "ہم ہم ہم" کر کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ ناچار کلوا نے اطاعت قبول کی چت لیٹ گیا۔

دو مہینے کلوا نے بوچا کی اطاعت میں عیش باغ اسٹیشن سے آغا میر کی ڈیوڑھی تک آر۔ کے آر لائن کے اوپر چکر لگائے۔ یہی بوچا کے دانتوں اور پنجوں کے زور سے حاصل کردہ جائداد تھی۔ کلوا نے بار بار چندو کی یاد میں اس جائداد کو چھوڑ کر دُور کے سفر کے قصد کئے۔ لیکن ہر دفعہ اس کو ناکامیاب واپس آنا پڑا۔ کیونکہ زمین کا چپہ چپہ کتوں کی جائدادوں میں تقسیم ہوا پڑا تھا۔ جس پر کہ غیر کا قدم رکھنا کتوں کے قانون میں سخت جُرم ہے۔ اگر کسی بڑی جائداد کے تنہا خونخوار مالک سے بچ کر نکل بھی گیا تو دوسری سرحد پر وہاں کے حاکم اور ایک، دو یا تین جتنے بھی شاگرد ہوئے اُن سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان ناکامیاب کوششوں سے اسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ زخم کھا کھا کر اس کا جسم پکا پڑ گیا۔ اور آدابِ جنگ کی تمام باریکیوں سے واقف ہو گیا۔

ایک روز کلوا تنہا آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف سے واپس آرہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ریلوے کراسنگ سے کچھ دُور بوچا استاد کی لاش لائن پر کٹی پڑی ہے۔ استانی پریشان کھڑی اس کو سونگھ رہی ہے۔ کیا کر سکتے تھے سوائے ہمدردی کے۔ خود بھی سونگھا۔ پاس کھڑے ہو کر اُستانی کا غم غلط کیا۔ وراثتاً جائداد کے مالک تھے۔ اس کا انتظام ہاتھ میں لیا۔ مُتعینہ غذا جو اس جائداد میں ریل سے گرتی تھی اور چیلوں کے پنجے سے ٹپکتی تھی۔ اب اس کے کھانے والے تین کی جگہ دو ہی مُنہ رہ گئے۔ ایک ہی مہینے میں اُستانی چربیا گئیں۔ اور ان کے بھی ہاتھ پیروں پر رونق

آگئی۔ لیکن اب اُستانی کو ان کا تعشق لونڈھیایا معلوم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن کلوا کو اکیلا چھوڑ کر ایک کبرے کتے کے پیچھے نکل گئیں۔ اب یہ تنہا رہ گئے۔ اکیلے کھانے والے اور اکیلے جائداد کی حفاظت کرنے والے۔ پیٹ بھر ورزش تھی اور پیٹ بھر خوراک۔ ایک مہینہ جو اور گذرا تو اب کلوا کی شان ہی نرالی تھی۔ سیاہ چمکدار مخملی کوٹ، لہراتی ہوئی لمبی دُم، گٹھا ہوا بھاری تھوتھنا، ہاتھ اور پیروں پر اُبھرے ہوئے پٹھے۔ بل کھائے ہوئے۔ قد میں بھی بڑے سے بڑا کتا ان کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چور اور آوارہ گرد کتوں کا ان کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی جائداد کو بھی اور وسعت دے لی تھی۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم کی اپنی طرف کی آدھی لمبائی تک قبضہ بڑھا لیا تھا۔ ایک دن اس پلیٹ فارم پر ایک جگہ ایک بُو تھی۔ . . . . کلوا کا محبت کا بھوکا دل تڑپ گیا۔ یہیں چندو بیٹھی تھی۔

کلوا اس جگہ کو سونگھے اور مُنہ اونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دیئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر، یہ روانہ ہو گیا۔ سیکڑوں ہزاروں ہر طرح کی بوؤں میں چندو کی بُو اس کے واسطے الگ تھی۔ بُو لیتا بُو ہی بُو چل دیا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان تک آنے میں اتنی مہموں کا سامنا نہ کیا ہو گا جتنی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو اس نے بلوچپورے تک پہنچنے میں عبور کیا۔ بیسیوں کتوں کو زخمی کر کے خود زخموں سے چُور جس وقت وہاں پہنچا رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلی وہی تھی، مکان وہی تھا، دوکان وہی تھی مگر بند تھی۔ اب لوگ اس کے اندر سو رہے تھے۔ دروازے سُونگھے۔ چندو کے ماں اور باپ دونوں کی بُوئیں تازہ تھیں مگر چندو کی بُو بہت خفیف تھی۔ کتے آتے، اس پر بھونکتے اور چلے جاتے۔ مگر یہ وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چندو کی بُو سونگھتا رہا جو برابر زائل ہوتی چلی جاتی تھی، یہاں تک کہ صبح چار بجے چندو کی بُو گم ہو گئی۔ اس نے دکان کے سامنے مُنہ اٹھا کر

رونا شروع کر دیا۔ کاش کوئی انسان اس کو یہ بتا دیتا کہ چندو اپنے دولھا کے ساتھ دولھن بن کر بانس بریلی گئی۔ مگر کون بتاتا۔ چندو کا باپ ہاتھ میں لُٹیا لئے یہ کہتا ہوا نکلا: "روئے جات رہے گو کر۔"

قصائیوں کے کتّے نہ اس کے ایسے تندرست تھے نہ قدآور۔ لیکن کچّے گوشت کے کھانے والے بے انتہا خونخوار۔ کلوا کے بھی دانت کھٹّے ہو گئے۔ جب کہیں جاکر ان کو گلی اور گلی کے پیچھے تھوڑے میدان پر قبضہ ملا۔ دن رات کا زیادہ تر حصّہ یہ چندو کی دکان کے آگے ہی گذارتا۔ جہاں اب اس کا پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ کلوا چندو کے باپ اور ماں دونوں کی مار برابر کھاتا رہا۔ لیکن اس نے دکان کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں کھانے کو کافی اور پھر عمدہ چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔ لیکن افسوس دل کی آگ محبت کے چھینٹوں کی طالب تھی سُلگتی گئی۔ کچھ عرصے بعد اس نے ان دونوں کے علاوہ غیروں سے بھی اشارے کئے اور محبت کے لین دین کا خواستگار ہوا۔ مگر دل کا سودا کہیں نہ پٹا۔ ایک برس اسی طرح گذر گیا۔ مگر آخر چندو آ ہی گئی۔

بالکل وہی چندو کچھ دُبلی اور ہو گئی تھی۔ بچّہ گود میں تھا۔ لیکن کلوا کو بھول چکی تھی۔ وہ کلوا سے ڈر گئی۔ انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ لیکن کلوا کتّا تھا زمین پر بچھ گیا۔ پیٹ کے بل زبان نکال کر پیر چاٹنے کو آگے بڑھا۔ پیر نہ ملے تو زمین چاٹی۔ کہاری کی جوتیاں جب پڑیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کہار نے ڈنڈے جب مارے تو سمٹ سمٹ کر چلّایا۔ لیکن سب لاحاصل۔ اس بڑی چکّی کے دونوں پاٹوں میں پتھر کم پستے ہیں۔ اور دل زیادہ۔ آٹھویں دن چندو پھر سُسرال چلی گئی۔

آج کالا کتّا غیظ و غضب کی تصویر بنا ہوا آوارہ گرد رہا ہے۔ کتّے اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیاہ مُنہ پر آنکھیں لال انگارہ ہیں۔ موٹی گردن پر بال کھڑے ہیں۔ اور دُم بالکل سیدھی پھیلی ہوئی ہے۔

اور آج ہی وہی پیارا بچہ منّن، باپ کی بے جا سختی اور ماں کی اندھی محبت کے باعث آوارہ ہے۔ اسکول میں جھڑکیاں اُٹھانے اور مار کھانے کے بجائے آج کے دن اس نے سُونی عیدگاہ میں آزادی کی عید منائی ہے۔ اب چار بج چکے تھے۔ منّن عیدگاہ کی چار فٹ اونچی دیوار پر بیٹھا سوچ میں تھا، دن تو گذر گیا، اب کیا کرے۔ گھر جائے نہ جائے، وہاں خبر ضرور ہو گئی ہوگی۔ ننھے سے دل میں وحشت کے پنکھے چل رہے تھے۔ وارفتہ دل، صحرانورد کلوا کا گذر ادھر سے ہوا۔ اس کی نگاہ بچّے پر پڑی۔

جس طرح انسانوں کے واسطے راتیں تاریک ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان میں سُہانی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے واسطے صورتیں، آنکھ، ناک، کان اور مُنہ کا صرف مجموعہ ہوتی ہیں۔ لیکن کُتوں کے لئے ان پر خوشی کی چمک، غم کی سیاہی اور محبت کی ارغوانی شعاعیں بھی عیاں ہوتی ہیں۔ کلوا نے دیکھا بچّہ اُداس بیٹھا ہے۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے نیچے نیچے جہاں وہ جا رہا تھا بچّے کی بُو رواں دواں تھی۔ اس نے اس بو میں کچھ خصوصیت محسوس کی۔

خیال اور خیالوں کے تحت واقعات کی یادداشت اس کو قدرت نے عطا کی ہی نہ تھی۔ نہ رہا گیا، گھوم کر بچّے کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف آگ کا اک سمندر موجزن تھا۔ جس میں سے لپلپاتے شعلے تا بہ فلک اُٹھ رہے تھے۔ ٹوکری بھر کے ایک بچّے کو اس میں پھینکا گیا۔ تو کیا ہوا؟ پلک جھپکی بھی نہ تھی۔ اور وہاں سبزے میں پھولوں کا ایک تختہ تھا، جو خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔ اس میں بچّہ بیٹھا کھیل رہا تھا۔ یہ قصّہ حضرت ابراہیم کا ہے۔ اب جن دماغوں میں عقل کی زیادتی ہو گئی ہے اور اس قصّے کو صحیح ماننے سے قاصر ہیں، آئیں، ادھر آئیں، میں اُن کو دکھائے دیتا ہوں کہ یہی ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، جفا کاری

میں بھینسا کتے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ استقلال میں پتھر کی سل کتے کے آگے گھس جائے گی۔ خونخواری اور دلیری میں جس وقت کتے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن محبت کی ایک چھوٹی سی چمکاری میں کتا پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اور اس وقت وہ حلم، عاجزی، انکساری اور خاکساری ایسی چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

منّن اور کلوا میں ایک دفعہ پھر نئے سرے سے دوستی شروع ہوئی۔ اس کی جیب میں بچی ہوئی ایک روغنی ٹکیا اور تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالوں میں کلوا کو پیش کی گئی۔ انڈا بھانہ انڈے کی بو اس میں بھی تھی کلوا کو بڑی میٹھی معلوم ہوئی۔ منن نے ڈرتے ڈرتے کلوا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کلوا نے منہ کھول کر محبت کے نشے میں دعاؤں، کہہ کر انگڑائی لی۔ منن کھیلتا کھیلتا کتے کو ڈھیلوں کے پیچھے بھگاتا قدرتاً گھر کی طرف آگیا۔ یہ بھی تو اُمید تھی کہ گھر میں اسکول سے بھاگنے کی خبر نہ پہونچی ہو۔ ڈرتے ڈرتے گھر میں گھسا۔ کلوا باہر ہی رہ گیا۔

محبت کی دیوانی ماں نے منہ دھلایا، ناشتہ کھلایا۔ اکنی کنکیا کے واسطے دی۔ دو پیسے کی برف کی قلفی لے دی۔ دو دفعہ باپ کے بے جا غصے اور منن کے بیچ میں سدِ سکندری بن کے حائل ہوگئی۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ اور منن سوگیا۔ افسوس اے جاہل ماں تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی تھاہ نہ لی۔ بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے چھوٹے رنج، ننھی منی خوشیاں، معصوم گلے اور شکوے ہوتے ہیں۔ اور بیوقوف مائیں اس دنیا کو کس مپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں۔

چھ دن کلوا نے استقلال سے بیٹھے بیٹھے اسکول کے سب تماشے دیکھے ساتویں دن ضبط برداشت سے باہر ہوگیا۔ سیاہ پینتیس سیر کا جسم ایک جست سے دروازے سے باہر نکلا اور ماسٹر سے تصادم ہوا۔ ماسٹر زمین پر

گر پڑا۔ کلوا اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ روتے ہوئے منن نے جلدی جلدی کتابیں اور بستہ سمیٹا اور سیدھا اسکول سے باہر بھاگا۔ سڑک پر جا کر "آؤ، آؤ" کی آوازیں لگائیں اور دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر میں خون آلودہ کان کو جھٹکتا ہوا کلوا بھی منن سے آن ملا۔ سر اٹھا کر منن کا مُنہ چاٹنا چاہا۔ تو اس نے سر پر سلیٹ ماری۔ کلوا خوش ہو گئے۔ اچھل کے آگے آگے ہو لئے۔

دوسرے دن بستہ بغل میں لیکر منن نے پھر عیدگاہ کا رُخ کیا۔ کلوا کو اس سے کیا مطلب تھا۔ جدھر وہ چلا اس کے پیچھے ہو لیا۔ واٹر ورکس کی دیوار کے نیچے پہونچ کر باہر لٹکی ہوئی املی کی شاخوں کے سایہ میں دونوں بیٹھے منن نے کوٹ کی جیبوں میں سے چُرائے ہوئے روٹی کے ٹکڑے، ہڈیاں اور بوٹیاں کلوا کو کھلائیں۔ اس کے بعد املی پر اُلجھی ہوئی پتنگ پر اینٹ کے ڈھیلے کا لنگر اُچھالنا شروع کیا۔ کلوا بھی ڈھیلے کی ہر اُچھال پر اُچھلتے تھے۔ لیکن فٹ سوا فٹ ان کی حد تھی۔ اس کے بعد عیدگاہ میں بسیار ڈھیلے بازی کے بعد ایک کچا کیتھا اُٹھا کر "تال کٹورے" کا رُخ کیا۔ راستہ میں منن نے کیتھے کو وہ چٹخارے لئے کہ کلوا کی بھی رال ٹپک پڑی۔ لیکن جب حصہ ملا تو سونگھ کر ہی چھوڑ دیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زند

جانوروں کو انسٹنکٹ (instinct) کا مادہ دیا گیا ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں۔ اور ہم کو عقل! جو ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

تیسرے دن شام کو جب آوارہ گردی کے مکتب سے منن گھر واپس ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مکان کے آگے اسکول کے تین لڑکے اور ایک ماسٹر کھڑے ہیں۔ باپ دروازے پر کھڑے اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر سے

پیر تک کانپ گیا۔ اور فوراً واپس لوٹ پڑا۔ پھر عیدگاہ پہونچا، وہاں پھرتے پھرتے جب شام ہونے لگی تو قدم گھر کی طرف خود بخود اُٹھنے لگے۔ واٹر ورکس کے پاس آکر پھر دل میں پنکھے چلنے لگے۔ عقل نے قدم روک دیئے۔ واٹر ورکس کی دیوار پر چڑھا۔ اندر بالکل سُنسان تھا۔ تھوڑی دُور پکے تالاب تھے۔ دیوار سے کُود ان کے کنارے پہنچا۔ کلوا بھی کُود پھاند کے ساتھ تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پکی دیوار تھی۔ جس سے ڈیڑھ فٹ نیچے شفاف پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ منن اپنی فکریں بھول گئے۔ کنارے اکڑوں بیٹھ کر مچھلیوں کی سیر میں محو ہو گئے۔ ایک مچھلی دیوار کی جڑ تک آگئی۔ منن نے جھک کر اُسے پکڑنا چاہا۔ پوری جان سے اندر لڑھک گیا۔ کلوا کچھ دُور تھا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اُس نے پانی میں جست ماری۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ پاس پہونچے بچہ پانی کی تلی کی طرف روانہ تھا۔ پانی بہت گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچے نے اچھالا کھایا۔ کلوا کے دھوکا نہ کھانے والے احساس نے اسے بتا دیا کہ بچہ کس جگہ ابھرے گا۔ وہیں پر موجود تھا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب بے ہوش تھا۔ لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ بچے کی گردن میں اور دوسرا پچھلے پیروں میں لپٹ گیا۔

اُفق کی سرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ سیاہ آسمان پر جھانک جھانک کر تارے نکل آئے۔ ایک چمگادڑ نے پانی کی سطح پر سراٹا مارا۔ دو بوند پانی منہ میں اُٹھاتا ہوا نکلا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد ایک بجو نے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر تالاب کو دیکھا اور سمٹ کر سرسراتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ رات بڑھتی چلی گئی۔ راہ عدم سے ایک تارہ ٹوٹا اور راہِ عدم میں غائب ہو گیا۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھول چکا تھا۔ جسم میں طاقت نہ تھی۔ یا اپنی ناک سے پانی باہر رکھ سکتا تھا یا بچے کی۔ دل میں طاقت وہی باقی تھی۔ مالک کی ناک

اوپر رہی اور تھکی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوئے سسکتے ہوئے بچے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلو کی پھولی ہوئی لاش وہیں چھوڑ دی۔ جس کو تھوڑی دیر بعد دو بھنگیوں نے نکال کر احاطہ سے باہر میدان میں پھینک دیا۔

تین گدھ فضائے آسمانی سے سنسناتے اترے۔ چھ فٹ کے پھیلے بازو سمیٹ کر آہستہ آہستہ اس لاش کی طرف بڑھنے لگے۔

بیرو

جوگی کی گرفتاری کے بعد سے بیرو کا مزاج اور بھی زیادہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ قصبہ کے لڑکوں نے اسے لاوارث سمجھ کر چھیڑنا شروع کیا تو وہ آتے جاتے ہر ایک انسان پر حملہ کرنے لگا۔ جانبین سے رنجشیں اس قدر بڑھیں کہ قصبہ کے لوگوں نے اینٹیں پتھر مار مار کر اُسے جوگی کی منڈیا بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پژمردہ دل بیرو منڈیا کو حسرت سے دیکھتا ہوا، ریلوے لائن کے پار اُتر کر جنگل کے کنارے نہر کے پُرانے بھٹے پر چلا گیا۔ جہاں سے اس نے گاؤں کی بھینسوں کو مار مار کر نکال دیا۔ لوگوں نے اُدھر سے راستہ چلنا بند کر دیا۔ کھٹیمہ کی بستی بھر میں اطلاع ہو گئی کہ جوگی کا مرکھنا نیل گائے بھٹہ پر ہے۔ ادھر کوئی نہ جائے۔ بیرو نے بھی بھٹے کی تنہائی کو غنیمت سمجھا۔ اس کو انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گاؤں کے جانوروں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اور اس کا جوگی (جس نے کہ اسے پالا تھا) دونوں یکہ و تنہا ایک دوسرے سے محبت کرنے کو پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں کا ثانی کوئی نہ تھا۔ نہ جوگی ایسا نیم برہنہ بڑے بڑے بالوں والا کوئی دوسرا انسان تھا نہ ایسا بھاری قدآور، سیاہ کوٹ، سفید مفلر، خوبصورت چوکھٹ دار داڑھی اور نوکیلے چمکتے سینگ والا دوسرا جانور ہی پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنی تنہائی

کا خیال آیا کرتا تھا۔ لیکن جوگی کی صحبت میں دل بہل جاتا تھا۔ جوگی اسے اپنے
اک تارے پر گانے اور بھجن سنایا کرتا تھا۔ نمک ملواں بھیگے ہوئے چنے کھلاتا
تھا۔ اس کی گردن کھجاتا تھا۔ اب جوگی بھی دفعتہً جدا ہو گیا۔ نہ معلوم کہاں
گیا۔ جوگی کی جدائی اور اپنی تنہائی سے بیرو افسردہ تھا۔ شروع جاڑے
کا موسم، شام ہو رہی تھی۔ بھٹے پر ایک گڑھے کے کنارے جہاں اس نے
اپنی بیٹھک بنائی تھی۔ بیرو کھڑا ہوا کبھی پانی میں اپنے عکس کو دیکھتا تھا اور
کبھی سر اٹھا کر ریلوے لائن کے پار شام کے دھوئیں سے دھندلی کھٹیمہ
کی بستی اور اسٹیشن کو دیکھتا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں طرف سریلے
گھنٹے بجاتے ہوئے گائیں اور بھینسوں کے ریوڑ گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔
آسمان پر ایک دو بگلے کو آواز دیتے ہوئے طوطوں اور کوؤں کے جھنڈ
بسیرا لینے جنگل کی جانب اُڑ رہے تھے۔ اور یہ پانی میں اپنے شاندار عکس کو
دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ اس کو افسوس تھا کہ یہ دنیا میں اکیلا ہی پیدا ہوا ہے
اسی رنج میں بیرو اکیلا وہاں کھڑا تھا۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ ہر طرف اداسی
چھائی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر جنگل تھا جہاں بالکل خاموشی تھی بہت
دور سامنے کھٹیمہ کی بستی سے ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کو اپنی پشت
پر ہلکی سی آہٹ معلوم ہوئی۔ اب جو گھوم کر دیکھتا ہے تو حیرت کی انتہا
نہ رہی۔ بالکل اسی کا ہم شکل ایک نیل گائے جنگل سے دو گز باہر کھڑا ہوا اسے
دیکھ رہا تھا۔ ویسا ہی سفید سینہ، سیاہ پیٹھ، ویسی ہی ڈاڑھی، قد بھی
قریب قریب اسی کے برابر تھا۔ لیکن گلے میں کوڑیوں کا کنٹھا اور بانسے پر
پتلی رسی کی ناتھ نہیں تھی اور جسم بھی اس کی طرح بھاری نہیں تھا بلکہ سیاہ
چھریرے گول چمکتے ہوئے ہاتھ پیر بڑے ہی خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔
اس کو دیکھ کر بیرو کے دل میں ایک عجیب گدگدی سی پیدا ہوئی۔ یہ آہستہ
آہستہ ایک ایک قدم اس نووارد کی طرف بڑھا۔ نیا نیل گائے بھی پھرتی

سے دُم کی تھاپی کو دائیں بائیں ہلاتا ہوا ایک ایک قدم اس کی طرف آیا۔ جب بیرو اس کے قریب پہونچا تو اس کے دل میں اس ہم جنس سے سینگ لڑانے کی خواہش از خود پیدا ہونے لگی۔ اس کا مدمقابل بھی اپنے سینگوں کی نوکیں سامنے کئے اور سر کو جھٹکے دیتا ہوا برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن جب ان دونوں میں چار چھ قدم کا فاصلہ رہ گیا تو جنگل کے نیل گائے کی نظر اس کے کنٹھے پر پڑی وہ فوراً ہی گھوم پڑا اور نوک دُم بھاگا۔ جنگل میں گھُسا اور غائب ہو گیا۔ بیرو پریشان تھا کہ یہ کیا ہوا۔ یہ آہستہ آہستہ گھنے جنگل تک گیا اور دیر تک تاریک جنگل کو دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جنگل میں گھس کر اپنے ہم جنس کو ڈھونڈے لیکن وہاں بالکل اندھیرا تھا۔ اور اندھیرے میں چلنے پھرنے کا یہ عادی نہ تھا۔ مجبوراً پھر بھٹے پر واپس آیا۔ ایک اُونچی سی جگہ اطمینان سے بیٹھا اور سوچ سوچ کر جگالی کرنے لگا۔ وہ بار بار جنگل کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید اس کا ہم جنس پھر آجائے۔

دوسرے دن صبح بہت سویرے بیرو جنگل میں گھُس کر اپنے ہم جنس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ یہ بہت دُور تک سال بنی میں چلا گیا جہاں کہ اُونچے قد آور درختوں کے نیچے زیادہ گھاس اور جھاڑیاں نہ تھیں۔ لیکن اب یہ جوں جوں آگے بڑھتا تھا۔ سال کے درخت چھوٹے اور جنگل گھنا ہوتا جاتا تھا۔ اسے اس گھنے میں چلنے میں بہت دقت ہوئی۔ یہ کھُلی ہوئی صاف زمین کا عادی تھا۔ ببلوں اور جھاڑیوں میں اس کے پیر اُلجھتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے اس طرح پھرنے میں لُطف آنے لگا۔ اس کو چلتے چلتے دوپہر ہو گئی لیکن سوائے چند موروں کے اور کوئی جانور یہاں نظر نہ آیا۔ یہ جوں جوں آگے بڑھتا تھا جنگل گھنا اور دشوار ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پریشان ہو کر لوٹ پڑا۔ جب یہ جنگل سے باہر نکلا۔ دن چھُپ رہا تھا۔ جنگل کے کنارے کانٹوں کی باڑھ سے گھری ہوئے

گیہوؤں میں یہ گھس گیا۔ ہرے ہرے گیہوں میں یہ چرتا ہوا ایک دفعہ پھر کھیتمہ کی طرف چلا۔ کہ شاید جوگی آ گیا ہو۔ راستہ میں کئی آدمیوں نے اس پر ڈھیلے برسائے۔ اور اس نے اُن پر حملے کئے۔ جب یہ منڈئیا کے پاس پہونچا تو لوگوں نے باقاعدہ لاٹھیوں اور پتھروں سے اس کی تواضع کی۔ جوگی کے ملنے کے بجائے کئی پتھروں کی چوٹیں اسے ملیں۔ ناچار پھر بھٹے پر آ گیا۔ اب نہ بھٹے پر اس کا دل لگتا تھا نہ بستی میں گذر! جنگل ہی کی طرف دھیان تھا۔ مگر وہاں بھی کیا تھا۔ بیرو بیچارہ بدمزاجی اور مُردہ دلی سے رہنے لگا۔ روزانہ شام کو اس جگہ کی طرف دیکھتا رہتا تھا جہاں کہ ایک دفعہ اس نے اپنے ہم شکل کو دیکھا تھا۔

ایک دن سویرے سویرے بیرو بھٹے سے کچھ دُور جنگل کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ لاکھوں زبردست درختوں کے تنے اُوپر کی سبز چھت کے اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے۔ ان ہی میں کچھ کھس کھس ہوئی اور رُک گئی۔ بیرو نے رُک کر بڑے غور سے ان بے شمار ستونوں میں دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ یہ پھر چلنے کو تھا، ایک دفعہ کئی ایک جانوروں نے ایک ہی ساتھ جُنبش کی جو کہ اب صاف نظر آ گئے۔ ان میں سے ایک اس کا ہمشکل سیاہ نرنیل گائے تھا۔ اور چار چھریرے بدن کی خوبصورت نازک اندام گائیں تھیں۔ جن کو دیکھتے ہی بیرو کے دل پر بجلی سی کوندی۔ اس کی ہم جنس مادائوں کا چھوٹا سا گلہ۔ کاش اس دوسرے نر کے بجائے بیرو خود ان کے ساتھ ہوتا۔ آج اس کو معلوم ہو گیا کہ دُنیا میں وہ تنہا جوگی کی صحبت کے واسطے پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں ایک جولانی پیدا ہوئی۔ پست خیال اُمیدوں میں رنج مسرت میں تبدیل ہو گیا۔ یہ فوراً اُن کی طرف دُلکی کی چال میں روانہ ہوا۔ کھیت اور جنگل کے درمیان کا تنوڑا کی باڑھ کو بغیر دیکھے بھالے، چرتا کچلتا ہوا نکلا چلا گیا۔ ادھر مادائوں نے ایک ایک دو دو قلانچیں بھر کر کچھ پیش قدمی کی۔ لیکن پھر سب کی سب اِدھر ہی مُنہ کر کے ساکت کھڑی ہو گئیں۔ گلہ کا مالک جنگی نیل گائے اپنے حرم کی حفاظت کے واسطے سینگ

جوڑ کر ماداؤں کے آگے کھڑا ہو گیا۔ بیرو کو بھی قدرت نے یا رگوں میں دوڑنے والے خون نے آگاہ کر دیا کہ دو نروں کے درمیان فاتح گلہ کا مالک ہوتا ہے۔ اور شکست خوردہ اُس وقت تک تنہا پھرتا ہے جب تک کہ وہ طاقت ور بن کر پھر نہ فتح حاصل کرے۔ یا کسی دوسرے کمزور نر کو شکست دیکر اس کی خوبصورت ملکاؤں پر قبضہ حاصل نہ کرلے۔ بیرو کو اپنی طاقت ہی پر ناز نہ تھا۔ وہ گلہ کو حاصل کرنے کے واسطے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اگر اس وقت اس کے سامنے ہاتھی بھی ہوتا تو وہ اس سے جا بھڑتا۔ اور اپنے خون کی آخری بُوند بہائے بغیر پسپائی قبول نہ کرتا۔

لیکن افسوس جیسے ہی وہ اپنے مدمقابل کے قریب پہونچا ماداؤں کی نظر اس کے گلے کے کنٹھے پر پڑی۔ وہ ڈر گئیں "پی قوں، پی قوں" چلا کر وہ بھاگ پڑیں۔ ان کے نر کو بھی ٹھہرنے کی اب کوئی ضرورت نہ رہی۔ جب مستورات ہی اجنبی کو ناپسند کرتی ہیں۔ تو پھر کیسی لڑائی۔ وہ بھی گلہ کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ پہلے تو بیرو حیران دستشدر کھڑا کا کھڑا رہ گیا، پھر وہ بھی اُن کے تعاقب میں دوڑا۔ بھاری جسم دوڑنے کا عادی نہیں۔ جنگل گھنا رہ گیا، اُن کی خاک بھی نہ پا سکا البتہ اُن کی بُو پکڑ لی۔ اسی کے سہارے چلتا رہا۔ اس کے واسطے آج یہ بالکل ہی نئی بات تھی۔ بوئیں طرح طرح کی اس کو ہزاروں روزمرہ معلوم ہوا کرتی تھیں لیکن ان پر کبھی اس نے غور ہی نہ کیا تھا۔ آج اس کو معلوم ہو گیا کہ ان کی بھی کتنی اہمیت ہے۔ ماداؤں کی بوؤں میں عجیب مستی تھی۔ اُن کے تعاقب میں مسرت تھی۔ یہ اسی طرح بہت دُور چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک جلے ہوئے جانور کے میدان میں نکل آیا۔ یہاں ہوا تیز چل رہی تھی۔ بُو بھی منتشر ہو گئی۔ لاچار کھڑا ہو گیا۔ میدان میں کوئی جانور نہ تھا۔ جنگل کے کنارے کنارے شمال کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں چھ مادین چیتلیں نظر آئیں بہت کچھ نیل گاؤں سے مشابہ تھیں۔ مگر کہاں نیل گائیں کہاں یہ چیتلیں۔ جونہی بیرو قریب پہنچا

یہ بھی اس سے ڈر کر بھاگیں۔

آج تک ببرو اپنی دُنیا، اپنے ہم پائے، اپنے ہم جنس، حتیٰ کہ اپنی ہستی سے بے خبر، انسانوں کی مصنوعی دُنیا میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ جہاں کہ اس کی ہستی ایک ناگوار مہمان سے زیادہ نہ تھی۔ نہ یہ دُنیا ہی اُسے اپنی سرگرمیوں میں شامل کر سکتی تھی نہ ببرو خود اس دُنیا کی زندگی میں کوئی حصہ لے سکتا تھا۔ زندگی کی جدوجہد۔ یعنی جنگ بقائے حیات، جس میں کہ رات دن ہر نفس مبتلا ہے۔ یہی زندگی کی دلچسپیاں ہیں، یہی چشمہ ہائے آبِ حیات۔ ببرو ان سے بے سروکار، از خود آجانے والی غذا سے شکم پُر، غموں اور مسرتوں سے بے بہرہ۔ حسرتوں اور اُمیدوں سے ناآشنا۔ جستجو اور تعاقب، نفرت اور محبت۔ غرض یہ کہ تمام جذبات سے ناواقف نیم خوابیدہ حالات میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ عقل و حواس گم کردہ ایک بے کیف نشہ اُسے گھیرے ہوئے تھا۔ زندگی اس کے لئے مشغلہ نہ تھی، مشغلے اس کے واسطے بیکار تھے۔ لیکن اب دفعتہً اس کو آگے زندگی، اصلی پُر لطف زندگی کا ایک میدان وا ہو گیا تھا۔ اس کو اپنی اصلی دُنیا صاف اور کشادہ سامنے نظر آرہی تھی۔ وہ دُنیا جس کے واسطے یہ پیدا ہوا تھا اور جہاں کا پتہ پتہ اس کے واسطے لامحدود مسرتیں لئے پیدا ہوا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی اُس کے سلب شدہ حواس تیزی سے بیدار ہونے لگے۔ کان خفیف آوازوں پر گھومنے لگے۔ ناک میلوں کی بُو پر تھر تھرانے لگی۔ پنڈلیاں سامنے کی رُکاوٹیں از خود دیکھ کر راستہ ڈھونڈنے لگیں۔ آنکھیں رات کی تاریکی چیرنے لگیں۔ ایک ہی ماہ میں ببرو پکّا جنگلی نیل گائے ہو گیا ہے۔ مگر

---

۱ خواہ پانچ ہی نان لئے جائیں۔ مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جنگلی جانوروں میں دس سے زیادہ حواس ہوتے ہیں۔

افسوس غلامی کا کنٹھا کوڑیوں کی مالا اب بھی اس کے گلے میں ہے۔ البتہ سڑی ہوئی ناتھ ایک ڈالی میں پھنس کر ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن اس کنٹھے نے اس کو پریشان کر رکھا ہے۔ جس طرح کہ کھیتہ کی لمبی سینگوں کی وجہ سے اس سے بھاگتی تھی۔ اب اسی طرح جنگل کی لبتی کنٹھے کی وجہ سے اس سے بھاگتی ہے۔ نئے اُگتے ہوئے چاندر میں چیتل، سانبھر، پاڑے اور نیل گائے راتوں کو خاموش پہلو بہ پہلو یہ چرتے ہوئے دیکھتا۔ لیکن جب یہ اُن کے پاس جاتا ہے تو سب ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر ٹہل جاتے ہیں۔ دن کی تیز دھوپ میں پناورن، بے جلے چاندروں گھنے کھیریوں اور کلکوں کے تختوں میں یہ مارا مارا ابھرتا ہے۔ ان میں جا بجا اطمینان سے بیٹھے جگالی کرتے جانور اسے ملتے ہیں۔ لیکن اس کی صورت دیکھتے ہی دُمیں ہلاتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور سر جھکا جُھکا کر گھنی گھاس کی پتلی گلیوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بیر داس سرگردانی اور پریشانی میں جنگل کے کئی رینج (Range) پار کر چکا ہے۔ کھکرا، لوہیا، سونی، گرکھا، جگبورا، بھانڈیاں پار کر کے منڈی کے شمال مغرب میں نیپال کی سرحد پر چاندنی کی پہاڑیوں میں پہونچ گیا ہے۔

چاندنی کی پہاڑیاں فلک بوس ہمالیہ کی پہلی سیڑھیوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ ہے۔ نہ یہاں پہاڑوں کی سردی ہے، نہ چیڑ کے درخت ہیں۔ وہی سال کا جنگل جنوب کی ترائی سے پھیلتا ہوا ڈیڑھ دو ہزار فٹ کی بلند چوٹیوں تک چڑھتا چلا آیا ہے۔ البتہ یہاں آکر یہ ختم ہو جاتا ہے۔ شمال کے آثار پر جو بے انتہا ڈھلوان ہے بڑے بڑے پتھروں اور پھیلی ہوئی چٹانوں میں پہاڑی سدابہار گھنی جھاڑیاں پہلے تو خال خال نظر آتی ہیں لیکن جو جو وادی میں اُتر دیہ بتدریج بڑھتی جاتی ہیں۔ یہانتک کہ نیچے پہنچتے پہنچتے اس قدر گھنی ہو جاتی ہیں کہ چاندنی اور نیپال کے گورا پہاڑ کی تنگ گھاٹی میں کاٹی ندی کو دونوں طرف سے گھیر کر چھپا لیتی ہیں۔

یہاں سبزے کی آرائش میں قدرت نے اپنی تمام فیاضیاں ختم کر دی ہیں، پتھروں پر کائی کی طرح سبزہ اُگتا ہے۔ اس سبزے کی ہر پتی کرشمۂ قدرت کا ایک نمونہ نظر آتی ہے۔ کوئی مخملی ہے، چاندی کی طرح چمکتی ہے۔ کوئی چکنی ہے ریشم کی طرح نرم اور نازک ہے۔ کسی پر سرخ ٹپہ ہے کسی میں سفید دھاریاں ہیں۔ کوئی انتہائی تراش اور کٹاؤ کی پتی ہے۔ لیکن ہیں سب ہری ہر جگہ ہر طرف ہرا ہی ہرا ہے۔ نیچے سبزے کا فرش اُوپر جھاڑیاں۔ جھاڑیوں پر بیلیں۔ ہر جگہ طرح طرح کے پھول۔ ہر جگہ طرح طرح کی خوشبوئیں۔ جگہ جگہ مقطر پانی کے شفاف بہت چھوٹے چھوٹے چشمے۔ گنگناتے، دھیمے دھیمے راگ گاتے، پتھروں کو کتراتے، چٹانوں پر جھلجھلاتے۔ دونوں طرف کی ڈھالوں پر سے بڑی جھاڑیوں کے سائے میں گھومتے گھامتے نیچے اُترتے چلے آتے ہیں اور کالی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کالی متواتر چھوٹے چھوٹے آبشاروں پر جھرجھراتی بڑے بڑے پتھروں کو کتراتی نکلتی ہوئی چٹانوں کی گھوم پر سنسناتی اس باغ کے بیچوں بیچ میں لہراتی ہے۔

دراصل یہ چھوٹی سی وادی باغِ ارم کا ایک نمونہ ہے۔ جسے سربفلک گورا ایک طرف سے اور ناقابلِ گزر سیدھا کگار لئے ہوئے چاندنی کا سلسلہ دوسری طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اسی قلعہ کے جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں یا بیت کی ٹھنڈی بیلوں کے اندھیرے سائے میں جنگل کا بادشاہ، گیارہ فٹ کا سیاہ دھاریوں والا سُنہرا شیر دن بھر غفلت کی نیند سوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب چڑیاں چہچہانا بند کر کے ڈالیوں میں دبک دبک کر بسیرا لینے لگتی ہیں اور لاکھوں جگنو چمک چمک کر کالی کو بقعۂ نور بنا دیتے ہیں تو پھر انگڑائیاں لیتا ہوا اور "دعاؤں، عاؤں" کرتا ہوا بادشاہ ٹہلتا ہوا ندی کے کنارے آتا ہے۔ دو چار کاکڑ[1] جو یہاں رہتے ہیں بھونک بھونک کر گورا کی چڑھائیوں پر چڑھ

---

[1] کاکڑ ایک چھوٹا ہرن ہوتا ہے لیکن کتے سے بہت ملتا ہے۔ بادامی کھال کتے کی سی ہوتی ہے دانت بھی کتے کے سے ہوتے ہیں۔ یہ بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتا بھونک رہا ہے۔

جاتے ہیں۔ یہاں چوپائے بالکل ہی کم ہیں۔ کیونکہ باوجود درختوں، پودوں اور گھاسوں کی کثرت کے کھانے کے قابل کوئی سبزہ یہاں نہیں ہے۔ غذا ترائی کے ہی جنگل میں کثرت سے ہے۔ اس لئے سانبھر، نیل گائے، چیتل اور پاڑے چاندنی کے دامن ہی میں رہتے ہیں۔

البتہ جب کبھی دو ٹانگوں والے جانور۔ آگ اُگلنے اور گرجنے والی لکڑیاں لیکر آجاتے ہیں تو پھر یہ جانور ان ظالموں کے خوف سے چاندنی کی چوٹیوں پر چڑھ کر خطرناک اور دُشوار راستوں سے دوسری طرف نیچے اُتر کر کالی کے گوشۂ عافیت میں پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہاں ان کو شیر کے پہلو بہ پہلو رہنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی ان کو یہ گوارا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ اس جنگل میں ٹھہریں جہاں کہ ظالم اور بے رحم انسان آگیا ہو۔ شیر باوجود درندہ ہونے کے جنگل کا رہنے والا ان کا ہمسایہ ہے۔ جس کی موجودگی ان کو چار و ناچار گوارا کرنی پڑتی ہے۔ وہ جنگل کا بادشاہ ہے جس کو کہ ہر ہفتے ان کے گلہ میں سے کسی ایک گلہ کو جان کا خراج دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ انسانوں کی طرح ظالم نہیں ہے۔ وہ بلاضرورت محض جان لینے اور خون بہانے کے واسطے کبھی شکار نہیں کرتا۔ جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تو وہ ان کے سامنے تک نہیں آتا۔ اور اگر سامنا بھی ہو جائے تو فوراً ہٹ جاتا ہے۔ اس کو چوپاؤں کو بلاوجہ ڈرانے کی عادت نہیں۔ جب بھوکا ہوتا ہے تو مجبوراً کسی ایک گلے کو تاک کر اُس کے سب سے کمزور ایک نفر کو اس خوبصورتی اور چالاکی سے دبا بیٹھتا ہے کہ اکثر گلہ کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اُن میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔ شکار مار لینے کے بعد اگر جانور بڑا ہی تو باسی اور تباسی تک کھاتا ہے یہاں تک کہ شکم سیر ہو کر کسی اندھیرے اور ٹھنڈے مقام پر جا لیٹتا ہے۔ جہاں سے وہ چار دن تک سوائے پیاس بجھانے کی ضرورت کے نہیں نکلتا۔ حتیٰ کہ ساتویں یا آٹھویں دن ایک دفعہ پھر بھوک اس کو پریشان کرتی ہے تو وہ رات کے اندھیرے میں گھنی جھاڑیوں میں چھپتا،

درختوں کی آڑ لیتا دبے پاؤں نکلتا ہے۔ جنگل کو کھلبلا دینا اور جانوروں پر ہیبت طاری کر دینا اس کا کام نہیں۔ یہ گلوں کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور ان میں سے بالکل اسی طرح خوراک حاصل کرتا ہے جیسے کہ ایک دور اندیش مالی اپنے کھیتوں میں سے ترکاری بتدریج نکالتا ہے۔ گوشت کو برباد اور ضائع کرنے سے اسے نفرت ہے۔ ہر جانور اس کی کھیتی ہے۔ جس کے بچوں سے اس کے گلّے قائم ہیں۔ جب کوئی جانور بڈھا یا کمزور ہو کر نسل کا سلسلہ آگے بڑھانے کے ناقابل ہو جاتا ہے تو پھر جنگل کا بادشاہ اس پکے اور ٹپک جانے والے پھل کو چپکے سے توڑ کر کھا لیتا ہے۔ گلّے اس سے ڈرتے ضرور ہیں لیکن انکی ہیبت ان کے دلوں پر نہیں ہے۔ اس کا تعاقب ان کیلئے ایک کبڈی ہے جس میں کہ وہ پوری دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی ایک کو شیر کی چستی اور چالاکی سے شکست ماننا بھی پڑتی ہے تو ان کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس بدنصیب ساتھی پر کیا گذری۔ اور دراصل گذرتی بھی کیا ہے۔ شیر کا بھاری جسم ایک ہی جست میں اس کی کمر پر گرتا ہے جس سے کہ فوراً کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسرے سکنڈ میں دو سخت جھٹکے گردن کی گرّی گرّی الگ کر دیتے ہیں۔ دو منٹ نہیں لگتے کہ جانور کی تمام تکلیفیں دور ہو جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے جس وقت انسان قتل اور غارت کے جذبے سے بھرا ہوا جنگل میں گھس آتا ہے تو یہاں کی دنیا ہی خوف و ہراس سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ وہ بلا ضرورت اور بلا امتیاز جانیں لیتا ہے۔ اور صرف غارتگری کیلئے۔ ظلم پر ظلم یہ ہے کہ جتنے جانور وہ ہلاک کرتا ہے۔ ان سے زیادہ زخمی خون میں نہائے جنگل میں مارے مارے پھرنے۔ دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کیلئے چھوڑ جاتا ہے۔

کبھی کبھی چاندنی کے ان جانوروں کو بھی وحشی انسان کی اس غارتگری کا،

سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ ٹنک پور منڈی اور ان پہاڑیوں کے درمیان کئی خطرناک دلدلیں اور نہایت گھنے جنگل ہیں۔ جنہوں نے چاندنی کی پہاڑیوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ عرصہ سے یہاں جانور بے خوف و خطر پُرامن زندگی بسر کر رہے تھے۔ کہ یکا یک ایک ہلکی سی بے چینی ان کی دُنیا میں پیدا ہوئی۔ یعنی ببر و دفعتہً نمودار ہوئے۔ اور مجنوں کی طرح یہاں کی نیل گایوں کی ڈار کے پیچھے پھرنے لگے۔ نہ اس ڈار کو ہی ایک جگہ قرار تھا اور نہ یہ دوسرے ہی جانوروں کو اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے دیتا تھا۔ اُن کے نر نے پہلے تو دلیرانہ مقابلہ کر کے ببر و کو بھگا دینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب دیو ہیکل حریف کے مقابلہ میں متواتر شکستیں اُٹھا کر کئی زخم کھا چکا تو پھر مقابلہ کرنا چھوڑ دیا۔ بس اتنا ہی کرتا تھا کہ ببر و کو دُور سے دیکھتے ہی مقابلے کی تمام تیاریاں کر کے سینگ نیچے کھریاں جما کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دشمن قریب آیا تو پھر بھاگ پڑا۔ اس عرصے میں مادائیں کافی دُور نکل جاتی تھیں۔ چھریرے بدن کا جنگلی نیلا چار چھلانگوں میں پھر اُن سے جا ملتا تھا۔ اور بھاری بھرکم ببرو اپنی سُست رفتار میں پھر اُن کا تعاقب شروع کر دیتے تھے۔

چاندنی کی پہاڑی ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ ایک مصیبت اور نازل ہوئی۔ ایک قدآور چڑچڑا اور بدمزاج سفید ریچھ اپنی زخمی مادین کے ساتھ گورا پار کی آٹھ ہزار فٹ کی اونچی برف کی چوٹیوں سے اُترا۔ گورا کو پار کر کے کالی کے کنارے آ گیا۔ جہاں سے آگے بڑھنے کی سکت اس کی مادین میں نہ رہی۔ کسی شکاری کی گولی سے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ نہ کھا سکتی تھی۔ کالی کے کنارے پانی پی پی کر بھوک اور زخم کی تکلیف میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کے آخری دن پورے کرنے لگی۔ اس عرصہ میں سفید ریچھ نے جو کہ قدرتاً بدمزاج ہوتا ہے اور اب اور بھی زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ بلا امتیاز چھوٹا یا بڑا جنگل کے تمام جانوروں کی زندگی دوبھر کر دی۔ ریچھ کے جو

بھی سامنے پڑ گیا 'بھاؤں، بھاؤں' کر کے اُسے بھنبوڑ ڈالا۔ پنجے مار مار کر حیثیت بگاڑ دی۔ ندی پر جا بیٹھا تو پانی پینے کے گھاٹ بند کر دیئے۔ چاندر میں گھس گیا تو چوپاؤں کی دن کی نیند اور جگالی حرام کر دی۔ ایک ہلچل سی مچا دی اور جب آٹھویں دن اُس کی زخمی رکھیتی مر گئی تو اس کا جنون اور بھی بڑھ گیا۔ جانوروں نے چراگاہیں چھوڑ دیں۔ بندھے ہوئے گھاٹ بدل گئے۔ اُن کی بیٹھکیں اجڑ گئیں۔ اس ہلچل سے شیر بھی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ شکار بھڑکا ہوا تھا بہت سخت دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی۔ بندھے ہوئے راستوں اور گھاٹوں پر پڑے پتھروں یا سال کے موٹے دوشاخوں کی آڑ میں یہ گھنٹوں بیٹھ کر انتظار کرتا لیکن کوئی ڈار ادھر سے نہ گذرتی۔

آج بھی وہ سخت غصے اور پریشانی میں تھا۔ بھوک کی آگ پیٹ میں لگے دو راتیں ہو چکی تھیں۔ تیسری رات نمودار ہو رہی تھی کہ بھوک سے بیتاب شیر پوستین جھٹکتا، شانے اور پیر زبان سے صاف کرتا گھنے گلاب کی اندھیری جھاڑی میں سے نکل کر کالی کی طرف جھاڑیوں جھاڑیوں روانہ ہوا۔ ایک گستاخ خرگوش نے کچھ دور اُس کے پیچھے خرلیش کی اور پھر غائب ہو گیا۔ ندی کے کنارے جونہی اس نے پانی پینا شروع کیا ایک مور نے اسے دیکھ لیا۔ وہ چلّایا اور اس کے چلّانے سے گرد و نواح کے دس بارہ مور اور چلّائے۔ جنگل میں پھر سکوت چھا گیا۔ شیر نے پانی پی کر پانی کو کچھ دیر بغور دیکھا۔ پھر مُڑ کر چار قدم چلا اور رُک گیا۔ بڑی دیر تک دُم کو آہستہ آہستہ جُنبش دیتا اور کانوں کے کٹورے گھماتا خاموش کھڑا رہا۔

آٹھویں تاریخ کی ہلکی چاندنی پتوں میں سے چھن چھن کر کہیں کہیں اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ سوائے آبشاروں کی مدھم میٹھی رم جھم رم جھم کے باقی تمام سکوت ہی سکوت تھا۔ "خوبصورت نہ، لوچیلے، نازک معصوم شیر نے دفعتہً ایک جھرجھری لی۔ وہ کچھ معلوم کر رہا تھا۔ اب اس کا مطلب حل

ہو گیا تھا۔ وہ پھرتی سے پھر اڑا۔ لمبی ڈُلکی کے دو قدم میں کالی تک آیا۔ اس کے جسم نے بغیر جھکولا لئے یا ہاتھ پیروں کے پٹھے تانے ایک پینگ سا لیا اور وہ کالی کے پار تھا۔ اس کیلئے بارہ فٹ کا فاصلہ ہی کیا تھا، ویسے ہی نکل گیا۔ یہاں سے پھر اسی لمبی دبی ہوئی ڈُلکی میں چند سکنڈ نہ لگے تھے کہ تین سو فٹ اوپر گورا کی چڑھائی کی ایک نکلی ہوئی نوک پر پہنچ گیا۔ اور یہاں چند پتھروں کی آڑ میں دبک کر چاندنی کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا۔ جس جگہ کہ اب شیر بیٹھا ہوا تھا یہاں سے کالی کے دونوں طرف کے جنگل، سامنے کی چڑھائیاں اور چاندنی کا کگارا بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ شیر دم کو اپنے پہلو میں سمیٹے مُنہ کھولے ہلکے ہلکے ہانپتا ہوا تیزی سے آنکھیں اِدھر اُدھر گھماتا ہوا سامنے کی کھڑی چڑھائی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً ریچھ جس کی کہ بُو اس کو ندی کے کنارے ہی آ گئی تھی سامنے پتھروں پر آہستہ آہستہ بھدّے پن سے چڑھتا نظر آ رہا تھا۔ شیر کا کھُلا ہوا مُنہ بند ہو گیا۔ دُم لٹھیا کی طرح پیچھے جا پڑی اور دُم کی پتلی نوک ناگن کی طرح دائیں بائیں لہرانے لگی۔ شیر بار بار دبکا ہوا پنجوں کے بل سُدھر سُدھر کر بیٹھنے لگا۔ وہ یہ انتظار کر رہا تھا کہ ریچھ کگارے پر پہنچ جائے اور وہ دیکھ لے کہ کس راستے سے ریچھ اوپر گیا ہے۔ ریچھ آہستہ آہستہ ایک ایک پتھر، جڑ اور ڈالی پکڑتا ہوا آخر اوپر پہنچ گیا۔ اور زبردست آنولے کے درخت کے نیچے جہاں کہ زمین کافی ہموار تھی نظروں سے غائب ہو گیا۔ تو پھر جنگل کے بادشاہ نے جنبش کی۔ اب جو چلا تو دراصل معلوم ہوا کہ شیر ہے۔ جس طرح بجلی کوندتی ہے۔ چار جستوں میں یہاں سے نیچے تھا۔ ندی کے آٹھ فٹ ادھر ہی سے ایک چھلانگ ماری اور تیس فٹ ہوا میں اُڑتا ہوا پار کی گھنی جھاڑیوں کے اندھیرے میں غائب ہو کر دو منٹ بعد پانچسو فٹ اوپر کھڑی چٹانوں اور پتھروں میں ناگن کی طرح لہراتا نظر آیا۔ یہ اس طرف نہیں جا رہا تھا جہاں کہ ریچھ گیا تھا بلکہ آنولے کے درخت سے کافی مغرب کی طرف ہٹا ہوا ایک ایسے کھڑے کگارے

کی طرف جا رہا تھا کہ جہاں پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ شیر اس چڑھائی کو اس طرح چڑھ رہا تھا کہ آنکھ کام نہ کرتی تھی۔ ابھی ایک پتھر پر ہے اور پھر جو دیکھا تو اُس سے بہت اوپر کسی دوسری چٹان کے سہارے جا رہا ہے۔ چڑھتے چڑھتے یہ ایک ایسی جگہ پر پہنچا جہاں نہ صرف پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا تھا بلکہ بیس فٹ اُوپر ایک چٹان چھجے کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ رُک گیا اور اُس کے چاروں ہاتھ پیر سمٹے، پیٹ اور سینہ زمین سے چھو گیا۔ اور پھر نگاہ کو مات کر دینے والی تیز چھلانگ میں وہ اوپر کی چٹان پر تھا۔ لیکن اس چٹان سے اوپر اب کوئی باہر نکلی ہوئی چٹان یا پتھر نہ تھا۔ بلکہ خالص ایک ہزار فٹ کی سیدھی کھڑی دیوار کے اوپر دو بہت زبردست پتھروں کے درمیان سے نکلی ہوئی ایک چٹان اس چڑھائی کا آخری زینہ تھا۔ چنانچہ شیر نے اب ایک پتلی اور نہایت خطرناک پگڈنڈی پکڑلی جو کہ بہت گھماؤ کے بعد سانپ کی طرح بل کھاتی آخر پھر اسی ایک ہزار فٹ اوپر کی نکلی ہوئی چٹان پر آملی تھی۔

جنونِ عشق جب سر پر سوار ہوتا ہے تو انسان ہو یا حیوان تکلیفوں اور تھکاوٹوں سے بے حس ہو کر دُنیا بھر کی صعوبتوں اور سختیوں کا سامنا دیوانہ وار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ صحرائے نجد کی وسعتیں شرما جاتی ہیں۔ دامانِ کوہ پھٹ کر جوئے شیر رواں ہو جاتے ہیں۔ تاج و تخت کے ہیرے جھونپڑوں کے چراغوں کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ صدائے عشق کے آگے لنترانیاں بھی خاموش ہو جاتی ہیں۔ اور چونکہ عشق محض ایک حیوانی جذبہ ہے (جیسا کہ ہر پینتالیس سے اوپر کی عمر کا انسان جان چکا ہے خواہ وہ اس کا قائل ہو یا نہ ہو) اس لئے ببر و پر اس کا اثر اسی حد تک اور زیادہ تھا۔ چابلی ماداؤں کی وہ ادائیں، اُن کی میٹھی میٹھی وہ صدائیں، مُشک و عنبر سے بہتر ان کی وہ مست

بوئیں سرِشوریدہ میں طوفان بہ سرطوفان برپا کررہی تھیں۔ جنگلی نیل گائے دن رات کے تعاقب، دن رات کی دوڑدھوپ سے پریشان، بھوک اور پیاس سے ہلکان، زخموں سے چُور دن بدن کمزور ہوتا چلاجارہا تھا۔ آخر ایک دن سرِشام جبکہ دن کی تیز روشنی ختم ہو کر ہر طرف رات کا سُہانا اندھیرا چھاچکا تھا جبکہ بارہ ماسی اوس اُونچے درختوں سے ٹپ ٹپ گررہی تھی اور جبکہ دو بن کھی چڑیاں ایک دوسرے سے دو میل کے فاصلہ پر سے "تڑاتو تو توتو" کے جواب سوال میں متواتر بحث کررہی تھیں جنگلی نیل گائے ببرو کے مقابلہ سے آخری دفعہ بھاگا۔ اس نے مکمل شکست قبول کرلی۔ اس دائمی تعاقب سے اپنی جان چھڑانے کیلئے وہ مادہاؤں سے دستبردار ہو کر ڈار سے دوسری طرف بھاگا۔ بے نر کی ڈار لاوارث بنی ہوئی چاندنی کی ڈھال پر ببرو سے ڈیڑھ سو فٹ اُوپر کھڑی تھی۔ ببرو اس طرف روانہ ہوا۔ مگر مادہئیں حسبِ دستور اس سے ڈر کر بھاگ پڑیں۔ ببرو کی سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آیا کہ وہ پھر اس نر کا تعاقب کرے، اس کو شکستِ فاش دے بلکہ ہلاک کرڈالے۔ ادھر جنگلی نیل گائے نے ان سب جھگڑوں کو چھوڑ کر چاندنی کے کگارے کا رُخ کیا۔ جہاں سے وہ اُوپر ہی اوپر جاکر مشرق کی طرف سے کھیر کے گھنے میں اُتر جانا چاہتا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ ان دو بڑے پتھروں کے پاس پہونچا جن کی آڑ میں ایک بڑی چٹان چھجے کی طرح ایک ہزار فٹ کی بلندی پر نکلی ہوئی تھی ٹھیک اسی وقت شیر بھی وہاں آچکا تھا۔ شیر آیا تو تھا ریچھ کو سزا دینے لیکن اُسے خوراک کی بھی سخت ضرورت تھی۔ بھوک سے بیتاب تھا۔ چھ گز کے فاصلہ پر بوڑھا زخمی نیل گائے جارہا تھا۔ دونوں بارہ چودہ فٹ کی موٹے پتھروں کے بیچ میں تین فٹ کی گلی سی تھی۔ اس میں سے وہ جھپٹا اور نیلے کو گرالیا۔ دو چار جھٹکوں میں شکار بے حرکت ہوگیا۔ عادت کے موافق شیر کو فکر ہوئی کہ کسی پوشیدہ تنہائی کی جگہ پر گھسیٹ لے جائے اور پھر کھانا شروع

کرے۔ لیکن پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پُشت پر کی چٹان بھی کافی تنہائی کی جگہ تھی۔ بالکم ازکم ناشتہ کر لینے کے واسطے کچھ دیر کیلئے شکار وہاں بھی کھایا جا سکتا تھا۔ گردن پر سے جہاں اُس کے کیلے گھُس گئے تھے خون کی دھاریں چل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر اس خون کو چاٹا اور پھر اطمینان سے بیٹھکر نیل گائے کے پُٹھے پر دانت جمائے۔ اگلے دونوں ہاتھوں سے ران اور کمر کو دبا کر مُنہ کو اوپر ایک جھٹکا دیا۔ تڑاخے کی ایک آواز ہوئی۔ ڈیڑھ سیر کا ایک ٹکڑا ران سے جُدا ہو کر شیر کے مُنہ میں آگیا۔ اس تڑاخے کی آواز سے ریچھ جو کہ ان پتھروں کے پاس سے گذر رہا تھا ٹھٹک گیا۔ بھاری جھبرا سر ہلا ہلا کر اِدھر اُدھر سونگھا "دو بوئیں مُشترکہ" جھلا کر نیچے سے ناک کے بانسے کو دو دفعہ پونچھا۔ اور دونوں پتھروں کے بیچ میں گھُس گیا۔ بجلی کی طرح شیر شکار کو چھوڑ گھوم کے کھڑا ہو گیا۔ آندھی کی طرح ریچھ نے جھٹکا لیا۔ اور راستہ روک کر سات فٹ اُونچا، تین فٹ چوڑا جھبرا دیو پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ دھوکہ میں ریچھ آگیا تھا۔ موقع ایسا خراب تھا کہ اب ہٹنا ناممکن تھا۔ اگر وہ ایک اِنچ بھی گھومتا ہے تو شیر اس کو دبا لیتا ہے۔ اس لئے سیدھا کھڑا دونوں ہاتھ آگے کو پھیلائے مقابلے کے لئے تیار تھا۔ شیر بھی اس طرح آمنے سامنے ہو کر حملہ کرنے سے ہمیشہ بچتا ہی رہتا تھا۔ اور اب یہ دیو ہر طرح سے تیار کھڑا ہے۔ کس طرح کس پہلو سے حملہ کرے۔ دونوں مدمقابل ایک منٹ اسی حالت میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ شیر چاہتا تھا کہ اس کا دشمن ذرا بھی جُھکے اور وہ اس کی پیٹھ پر جا پڑے۔ ریچھ اس داؤں میں تھا کہ شیر ذرا بھی اُٹھے کہ وہ اُس کے پیٹ کے نیچے گھُس جائے، اسی خیال سے ریچھ کچھ آگے جُھکا ہی تھا کہ شیر نے تڑپ کھائی۔ دونوں ہاتھوں کے ناخونوں، پسلیوں میں اور دانتوں کے کیلے ریچھ کی کمر پر ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف گھسا دیئے۔ ریچھ کا بھاری سر اور کھڑکھڑاتے ہوئے بڑے بڑے

ناخنوں سے آراستہ دونوں ہاتھ شیر کے پیٹ کے نیچے تھے۔ ایک سکنڈ بھی نہ لگا کہ شیر کی آنتیں نکل کر اُن میں الجھی ہوئی تھیں۔

اِدھر تو یہ ہو رہا تھا، اور اُدھر عشق کا بھوت حسبِ دستور سر پر سوار ببرو کو اندھا بنائے لئے پھر رہا تھا۔ جنگلی نیلے کی بُو پر وہ چلا آرہا تھا۔ سب یوئوں سے بے خوف اور بے خبر۔ آخر وہ اس جگہ آ ہی گیا۔ جونہی وہ دونوں پتھروں کے اندر داخل ہوا۔ اس کو یہ سین دکھائی دیا۔ چھوٹی سی نکلی ہوئی چٹان پر ایک طرف نیلا بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دوسری طرف دو زبردست ایکدوسرے میں گتھم گتھا زور کر رہے تھے۔ ببرو کو بھی اپنی طاقت پر ناز تھا۔ پھر خطرے کی موقع پر حملہ کرنا قدرت نے اسے سکھایا تھا۔ اس کا سر نیچا ہو گیا۔ بھاری گردن اینٹھ کر درخت کا لٹھ ہو گئی۔ نو من کا سیاہ جسم اپنا پورا وزن لگانے کو تیار ہو گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر جو لپک کر ایک ٹکر لگاتا ہے تو شیر اور ریچھ دونوں تین پلٹے کھا کر چٹان کے نیچے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر سے قلابازیاں کھاتے نیچے گر رہے تھے۔

ان کے لہو سے رنگی ہوئی چٹان پر ببرو کا کنٹھا پڑا تھا۔ جسے ببرو نے بڑے افسوس سے دیکھا۔ شیر نے ایک پنجہ اس پر بھی چلایا تھا۔ لیکن اوچھا پڑا تھا۔ جس سے صرف کنٹھا ہی ٹوٹا۔ گردن پر زخم نہیں آیا۔ شیر اور ریچھ ایک ہزار فٹ کی مسافت طے کر کے جس وقت نیچے کی دوسری چٹان سے ٹکرائے تو بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ جس کی آواز دیر تک وادی میں گونجتی رہی۔ اور ابھی یہ گونج ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک دھماکا پھر ہوا۔ اور پھر وادی اور اطراف کے پہاڑ گونج اُٹھے۔ اب کی ببرو نے اس نیلے کی لاش کو بھی نیچے دھکیل دیا تھا۔ اب خون آلود وہ چٹان خالی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ببرو وہاں ساکت کھڑا تھا۔ یکایک "پی تو، پی تو" کی پیاری پیاری آوازیں اس کے کان میں

آئیں - مغرب کی طرف بیرو سے سو سوا سو فٹ اونچی ایک چوٹی پر مادئیں
کھڑی ہوئی اسے بُلا رہی تھیں۔

اور اُن میں وہ جا ملا۔

Best.

گوری ہو گوری

چوماسہ کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے۔ ٹر، ٹر، ٹر۔ پیپل کے سوکھے ڈگالے پر اُلّو کہتا تھا۔ ہک ہو۔ ہک ہو۔

بسنتی نے کروٹ لی۔ پھر مُنہ پر تھپڑ مارا۔ بولی "ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔"

پیپل پر اُلّو بولا۔ ہک ہو، ہک ہو۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا۔ اُس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی "مری جائے۔ پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"

ہک ہو، ہک ہو۔

"اجی او جی۔ اجی او جی۔ اٹھو نا۔ گھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔"

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹکا، بولا "سون دے ری۔ اری ناکھائے لے تو ہے۔"

"اُٹھو جی اُٹھو۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے۔ اُو اٹھو۔"

مادھو "اُدھر سے تو را ڈر" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا۔ جلدی سے پھر اُوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر پھر نیچے دیکھا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھا۔

چھوٹا سا کچّا گھر تھا۔ پھوٹی چمنی کی دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھلجھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا "جو کا ہوا رے!"

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی "اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام۔ بھیکا کو جگا لؤ۔ ارے رمکلیا کو جگا لؤ۔ ارے ان ہن کی پیڑھی لو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا۔ رمکلیا ہو۔ اری او رمکلیا۔ سوئے جات رے۔ ارے اٹھ اٹھ او بھیکا"

آٹھ برس کی دُبلی پتلی رمکلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا۔ دودھ پیتا پاس لیٹا بچّہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلّائے "اری میّاری" موہے لئے لے باپو رے۔ اری میّاری"

"چُپ کر چُپ۔ مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دُور کہیں سے آواز آ رہی تھی۔ گڑُپ۔ شل شل شل گڑُپ۔ شل شل شل۔

گھگو بولا۔ ہک ہو۔

بسنتی روتی ہوئی چلّائی۔ ارے پرینم بھیا آئی گئی۔ ارے مورے بچّے کی جو رے"

کھٹولے سے کود۔ پانی میں چھپاتے بچّے ماں سے چمٹے۔ مادھو اُٹھا، دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی "اجی جادت کہاں ہو جی"

باہر سے آواز آئی "مادھو بھیّا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اٹھ رے اُٹھ"

شڑپ، گڑُپ، شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

ممم ممم۔ ییں۔ بکری بولی۔ ماں۔ ہاں آں۔ ماں ہاں آں۔ کہیں گئیاں

چلّا رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پُروے میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ اُٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پُکارتا تھا۔ کوئی چلّاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اُٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے چون کی مٹکی اُٹھائی۔ تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ مٹکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔ اُسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا۔ پھر وہ بھی گھومی۔ دری۔ پچھورا۔ کھتری سب کچھ اس پر تھا۔ لو وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلّا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کی سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا "بھاگو بھاگو۔ او بسنتی نکل، ارے مادھو بھاگ۔"

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا۔ رانوں تک آیا۔

"بھاگو بھاگو۔ مادھو بھیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکلت کا ہے ناہیں۔" باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی "ارے مورے گڑوے۔ ارے موری ہنسلی تو نکال لے رے۔"

"چل چل تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لئے لوں۔ اُڑھنا پچھورا تو دبائے لوں۔"

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلّاتا تھا۔ دروازہ پر دھکّے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا "چالو۔ چالو۔ سب چھوڑو۔ جان ہی بچائے لو۔ چالو۔ چالو۔"

اس گڑبڑ میں۔ جلدی میں۔ گھبراہٹ میں، اندھیرے میں دری، پچھورے کپڑوں کیلئے پکارتی۔ ناج اور ناج کی کٹھیوں کیلئے پکارتی۔ برتنوں اور زیور و

کے لئے پھڑکی بسنتی نے یہ بھی کہا" بھیا رے رمکلیا کو کو ئو لے لے رے"
لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا" موں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہر رے"

پانی کی شل شل۔ رات اندھیری۔ بادل کی گرج ، بجلی کی چمک۔ کمر کمر سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی۔ پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلّا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا۔ دوسرا سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا۔ دوسرا ابھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پُروے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہو کر پون میل کے فاصلے پر دور ریل کی اونچی پٹری کا رُخ کیا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور بھیکا ان کے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اٹھالیا تھا۔ اُن کو اس کا اطمینان تھا۔ مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی جو کہ گاؤں سے باہر کنوئیں کے پاس بنگلیہ پر اُس کے سالے کے ساتھ رہتے تھے۔ بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کیلئے بیتاب تھی" اُدھر تو وہ اِکلا ہی رہتا ہے۔ نہ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے آیا کہ نہیں" مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنبھالتے ہوئے دُہرایا" کو وُ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے بروے کھولے کہ ناہیں"

اندھیری رات تھی ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اُونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر دُور اور نزدیک آوازیں ان کی آرہی تھیں۔

"جانکی ہو جانکی"

"آئے رہوں دادا"

"مرلی رے مرلی"

"بھلا رے بھلا۔ چالے چالو"

مادھو بھی بار بار سالے کو پکارتا تھا "ناگا او ناگا" اور جواب نہ آتا تھا۔ اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا۔ "لین کے لگے ترپا ہے ترپا" کوئی بولا "سنبھلے سنبھلے نکلے چالو" کسی نے کہا "ڈٹے رہو بھیّا۔ ڈٹے رہنا بھیا۔ آگئی لین"

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی "مادھو بھیّا ہو۔ کوؤ مادھو بھیا دیکھو؟"

کسی نے جواب دیا "بڑا دکھوئی یا۔ ہاتھ لوتو لوکت ناہیں"

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا "بھلی ہے بھلی۔ آت ہوں۔ بروے لے آیا رے؟"

ناگا چلایا "لسبنی کتے بولت ناہیں!"

"ارے ہے رے مورے ساتھ۔ بروے کتے چھوڑے؟ لے آیا رے؟"

"آئے جاؤ۔ آئے جاؤ" آر۔ کے۔ آر کی لائن پاس آگئی تھی۔ ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈکراتی بھینسیں، چلّاتی گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھیگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سُونی پٹری آباد ہوگئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آگیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پُروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا

اور دو سگے بھائی کرمی کم تھے۔ بچوں میں رمکلیا کم تھی۔

بسنتی نے رمکلیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں کرمی بھائیوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا۔ کیونکہ ایک تو دونوں تیراک تھے۔ دوسرے کانی اونچے مکا کے کھیت میں بہت مضبوط اور اونچے مچان پر وہ سوئے ہوئے تھے۔

رمکلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ سب دلاسہ دیتے تھے پھر کوئی سمجھاتا تھا۔ رو دھو نا صبر کر۔ شاید دونوں کرمیوں میں سے ہی کوئی آگیا ہوگا۔ کسی درخت پر ہی لیکر بیٹھ گیا ہو۔ چمار کا لڑکا بھی تو وہیں تھا۔ اس نے ہی تو کہا تھا گودی لے لے گا۔ وہی اس کو لیکر کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔ پر ممتا کی ماری دکھیاری چپ کیسے ہوتی۔ اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ ناگا ہچکیاں لیتا تھا۔ اور وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی اڑاتی تھی۔ توکاں آں ھ، توکاں آں ھ۔ یہ بھی دکھ بیتی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے نا جانے۔ بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دکھیا روتی ہے۔ توکاں آں ھ۔

روتی ہچکیاں لیتی ہوئی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور روئی۔

"گوری رے۔ موری رمکلیا... اِکھ اِکھ اِکھ اِکھ

گوری رے اب تو ہے کون چرائے ... اِکھ اِکھ اِکھ اِکھ

گوری رے اب تو ہے کون کھلائے .. اوھ اوھ اوھ اوھ

گوری رمکلیا تو گئی رے ... اوھ اوھ اوھ اوھ

گوری توری رمکلیا ... اِکھ اِکھ اِکھ اِکھ

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی۔ توکاں آں ھ

کوئی جانے نہ جانے دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی

نے سسکیاں لے لیکر آخر صبح ہی کردی ۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پُروے کی طرف اُٹھ گئیں ۔ سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پُروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آموں کے درخت تو تھے مکان بہہ چکے تھے ۔ اور اگر کوئی بچا کھُچا مکان ہوگا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہوگا ۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا۔ جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے مل رہے تھے ۔ اور پھر اُن کے پار ۔ میلوں، میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا نالا تھا پانی کا دھارا تیزی سے چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی لنگوٹی کس پانی میں کُود پڑے ۔ تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے ۔ وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی تو موجود تھے رمکلیا نہ تھی ۔ چمار کو تیرنا نہ آتا تھا۔ اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک پٹیلا ڈھونڈھ لیا تھا۔ جو کہ درختوں میں اُلجھ کر تیرتا ہوا رہ گیا تھا۔ سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پٹیلے پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے اور یہ لوگ کھینچتے ہوئے اسے لے جائیں ۔ مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے ۔ ڈر کے مارے مرا جائے پانی میں اُترے ہی نہیں ۔ بہت سمجھایا، خوشامد کی، لیکن راضی ہی نہ ہو ۔ اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بُری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے ۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آگیا ۔ چمار کے درخت پر چڑھ کر اور اُس کی گردن پکڑ، مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہوگیا ۔ پٹیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہو لیا ۔ اور سب باری باری پٹیلے کو دھکیلتے ہوئے لے چلے ۔ رستے میں کسی نے کہا "رے اب بہائے روے سا بچی سا بچی ناہیں ڈبو ئیں دین تو بہے اتے ہی" بچارے نے سب اُگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارے اُن چار آدمیوں کے ساتھ رہا تھا جو کہ مادھو اور اس کی بابا بچوں کو نکالنے گئے تھے۔

اور بسنتی کے چلاّنے پر اسی نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لے گا۔ لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے۔ اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس سے ہی لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ نہ ملے۔ پانی اور بڑھ گیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ یہ سُن کر سب نے کہا "ڈبوئے دو ایسے پاپی کو۔ کیا کرنا لے جا کر ایسے دُشٹ کو۔"

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پٹڑی پر اُتار ہی دیا۔

وہاں سیوا سمیتی کے سچّے خدمت گار۔ کانگریس کے ذرا بڑے اور ذرا مغرور، تھوڑا کام اور بہت باتیں کرنے والے لیڈر، لال صافے والی پولس کے اینٹھتے اکڑتے سپاہی موجود تھے۔ مدد ان کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے تھے۔ تیل، گھی، آٹا، لکڑی، دال سیوا سمیتی والے لائے تھے۔ امن انتظامات پولس والوں کی طرف سے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان کانگریس والوں کی طرف سے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں بھنی خوشی کھانے پکنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ دو چار جن کے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں اُن کی مرہم پٹی ہوئی۔ لیکن بسنتی کے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا۔ مادھو اور ناگا خود ہی پریشان تھے۔ ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اس کے ساتھ روئی تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی۔ کا جانے بھور بھئے کتنے چال گئی۔

جب تک اندھیرا رہا۔ ہڑپ، اگڑپ، اگڑاپ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا۔ اور روتے روتے بے دم کر دیا۔ بھرکی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں، نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا،

گُچلے ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے پر ایک کالا سانپ کنڈلی مارے بل کھایا بیٹھا دُہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ جس میں سے اکّا دُکّا پیڑ کہیں کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ آدھا ڈوبا آدھا نکلا طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی اور پھر چلائی۔ ڈری، سہمی اور چاروں طرف اُس نے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی اور دوسرے کالا ناگ تھا اور پانی ہی پانی تھا۔ جس میں پھرکی ایسے گھومتے کٹورے بنتے تھے۔ اور ہڑپ ہڑپ کر کے غائب ہو جاتے تھے۔

رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موندھ لی تھیں اور "اری میّا ری، او میری میّا" کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی،

"تو کاں آں ھ"

رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مُردہ چہرے پر ہلکی مُسکراہٹ آئی۔

"تو کاں آں ھ" آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے "ہرے رام گوری بولے" کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں۔ لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا۔

"گوری ہو گوری"

جواب آیا "تو کاں آں ھ"

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکلیا نے پھر پکارا وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دُور سے ایک اور آواز آئی "او ماں آں ھ" باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اُس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر روتے اور ہچکیاں

لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلّائی "گوری ہو گوری۔
گوری ہو گوری۔
ارے گوری رے آئے جا۔
ہائے رے میّا ناہیں آوت۔
گوری ہو گوری۔
گوری میّا آئے جا ری"

لیکن گوری نے رُخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رمکلیا کی طرف دیکھا۔ اڑا کر بولی اور پھر اُدھر ہی تیرتی چلی گئی۔ جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آ گیا جہاں سرِ شام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچے کی آواز کا جواب دیتی تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی، اُسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آ کر اپنی کھر اور پیٹ سے اُسے دھکیلا۔ ایک طرف چلی۔ بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچہ چھ فٹ نیچے زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسّی سے بندھا ہوا تھا اور رسّی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی۔ لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسّی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلّاتے بچے کو وہیں چھوڑا اور پھر رمکلیا کی طرف رُخ کیا۔

رمکلیا رونے چلّانے کی تھکن۔ ڈر خوف اور آخر میں انتہائی ناامیدی

کا اب تک برابر مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اُس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بیہوش پڑی تھی۔ گوری نے کئی آوازیں دیں اور جب بھی رمکلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی، کھُردری گرم گرم زبان سے اُس کا مُنہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آگیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا۔ "گوری میّا، گوری میّا" کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رمکلیا چھت سے گھسٹ پانی میں آگئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور جھپٹ جھپٹا کر گوری کی پیٹھ پر آگئی۔ اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس گئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکر کھائے اور چلی۔ اور جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسّی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہوگیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتی ہوئے چلے۔ رمکلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹڑی کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اس لئے یہ دونوں بہاؤ کی ہی طرف تیرتے چل دئیے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹڑی پر چڑھ آئے۔ لیکن جہاں گانوں والے تھے تین میل دُور یہ نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دیئے تھے۔ اور جب گانوں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا نہ رمکلیا تھی۔ بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کھُچا حصہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رمکلیا، پیچھے بچھڑا "اُو ماں آں ھ" کے سوال جواب کرتے گانوں والوں میں پہنچے تو ہل چل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کُودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی تھی کبھی بچھڑے کو اور کبھی

گوری کے چمٹتی تھی۔ اور گائے کہتی تھی "ہم۔ ماں آں ھ۔ ہم۔ ماں آں ھ"

آواز آئی "بول گوری میّا کی جے"

پچاس آوازوں نے جے پکاری۔

پھر آواز آئی "بول گئو ماتا کی جے"

آئینۂ حیرت

پہلا باب

جب دن انگڑائیاں لے لے کر رات پر دست درازیاں کر کے اپنی ساعتیں بڑھانے لگتا ہے تو افسردہ راتوں کو دن بھر کی برسی ہوئی تمازت فضا میں منتشر کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ روزِ گذشتہ کی تپتی ہوئی زمین پوری طرح ٹھنڈی بھی نہیں ہونے پاتی کہ رات کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے، اُفقِ مغرب سے روزِ روشن جھانکتا ہے۔ تاریکی شرما کر پہاڑوں، دریاؤں میدانوں اور شہروں پر سے سمٹتی ہوئی مغرب میں جا چھپتی ہے۔ روزانہ یہی ہوتا ہے۔ راتیں راتیں دُنیا کو ٹھنڈا کرنے نہیں پائیں کہ دن آکر اور زیادہ آگ برساتا ہے، نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ بتدریج حدت بڑھتے بڑھتے دُنیا تپتی ہوئی بھٹی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

تو پھر! میدان تپتے ہیں۔ شہر جُھلستے ہیں، زمین سے لُو کے اُٹھتے ہیں۔ درو دیوار سے لپٹیں اُٹھتی ہیں۔ مکانوں میں دم گُھٹتا ہے۔ سڑکوں پر ہُو کا عالم ہوتا ہے۔ خاک اُڑتی ہے، لُو چلتی ہے۔ جدھر جاؤ بھوبل سی جلتی ہے ——— !

اس وقت جبکہ میدان خشک ہو جاتے ہیں۔ پودے جل جاتے ہیں۔ درخت مُرجھا جاتے ہیں۔ تب بھی مادرِ ہند کے پہلو میں ایک پُرسکون ٹھنڈا گوشۂ عافیت ہوتا ہے۔

مُردہ، خشک گرد آلود، تپتے جھلستے، دہکتے چمکتے میدانوں کو چھوڑ کر۔ تلملاتے پرندے جانبِ شمال اُڑتے ہیں۔ اور کوسوں، منزلوں، شمال پس شمال اڑتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھنے سبز جنگلوں کا کنڈل کھینچے، سیاہ دیو ہمالہ سنہرا، روپہلا، ہیرے سے زیادہ چمکتا، برف کا تاج لگائے نظر آتا ہے۔ تھکے پیاسے، پژمردہ چڑیوں کے جُھنڈ چہچہا اُٹھتے ہیں۔ آخری منزل کا دم توڑ سپاٹا بھرتے ہیں۔ اور پہاڑوں کے پھیلے ہوئے سبز دامنوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہاں دُنیا ہی اور ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہے، زمین ٹھنڈی ہے۔ پتھر ٹھنڈے ہیں۔ پتھروں میں چھوٹے چھوٹے چشمے بہتے ہیں، وہ بھی ٹھنڈے ہیں۔ برف میں جھلا ہوا شفاف پانی، کہیں بُوندوں بوندوں ٹپٹپاتا ہے۔ کہیں ننّھی مُنّی نالیوں میں شلشلاتا اور جھلملاتا ہے۔ کہیں پتھروں کو کتراتا ہوا چٹانوں سے سلوں پر اور سلوں پر سے چٹانوں پر کودتا ہوا پانی چشموں کی صورت میں گنگناتا مُسکراتا، ہنستا، ہنساتا ہوا بہتا ہے۔ اس کے دونوں طرف چھوٹے بڑے درخت، درختوں کے نیچے جھاڑیاں، جھاڑیوں میں پودے۔ اور پودوں کے نیچے مخملی گھاس اور کائی سب مُسکراتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ بُلبلیں اور شامائیں میٹھے میٹھے راگ گاتی ہیں۔ ہر طرف زیست کے سامان ہیں۔ ہر طرف پھول خنداں ہیں۔ ہر چیز شاداب ہے۔ ہر چیز تروتازہ ہے۔ مٹی پر فرش سا سبزہ ہے۔ پتھر پر کائی کا سبزہ ہے۔ درخت میں ڈالیوں، پتّوں کا سبزہ ہے۔ بڑے بڑے گداؤں پر فرنیں اُگ آئی ہیں۔ گویا اپنی ڈالیوں اور پتّوں سے جُدا اپنا سبزہ الگ آراستہ

کیا ہے۔

اس جانفزا روح پرور آب و ہوا کا طالب کون نہیں؟ پر جس کو اللہ مقدرت دے۔ کیا چوپائے، کیا پرندے، کیا انسان۔ مگر تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کو یہاں تک آنا نصیب ہوتا ہے۔

تپتا ہوا جُون کا مہینہ ہے۔ پتھر کی سل، کھولتی زمین، تانبا ایسا صاف دمکتا آسمان، تھپڑ ایسے جھلستے لُو کے جھونکے، جھلکتی چمکتی، چُندھیائی جھلجھلاتی دھوپ ہے۔ اور تین نفر دُھندلے، سیاہ، ہنوز دُور افتادہ پہاڑوں کی طرف راہی ہیں۔ ایک انسان ہے، دوسرا جانور اور تیسرا ...... تیسرا ...... انسانوں کی گنتی میں ہے نہیں، جانور ہے نہیں ... تیسرا ایک ڈھٹیال ہے۔ مزدوری کے بکھیڑے میں، پیسوں کے لالچ میں دھوکے میں آ کر اس کھولتی ہوئی میدانی دوزخ میں تین دن ہوئے اُتر آیا تھا۔ اب اُفتاں و خیزاں واپس جا رہا ہے۔ گرمی کی شدت سے پسینے میں نہایا ہوا ہے۔ سانس پھُولا ہوا ہے۔ دماغ چکرایا ہوا ہے۔ سرد پہاڑوں کا رہنے والا، اس کی تو جان پر ہی بن آئی ہے۔ زندہ پہونچ جائے تو بھر پایا۔ کاٹھ گودام کی چمکتی سُنسان سڑک پر جہاں بگوُلے اُٹھتے ہیں بہ سُست قدم چلتا ہے۔ اُسی پہاڑی کھچی ہوئی چال میں اُتو بنا چلا جا رہا ہے۔ اونی کنٹوپ نما ٹوپی ڈورے سے بندھی سینے پر لٹک رہی ہے۔ سر پر کمل تہ کر کے رکھ لیا ہے۔ گھنے جھبرے بالوں پر ایک تہ اور لگائی ہے۔ پیٹھ پر چونگلے کے ساخت کی ٹوکری بندھی ہے۔ طرح طرح کے اُونی چیتھڑے اور گودڑوں کا مجموعہ لبادہ در لبادہ، کہیں پوستین کے ٹکڑے کہیں لیریں سب میلے گندے پسینے سے تر پہنے ہوئے ہے۔ ٹانگوں میں موٹے کپڑے کا میانی کی بے جا مدد سے آزلہ سلا ہوا، چوڑے پائنچے اور تنگ مُہری کا پاجامہ اس

اُس کے نیچے ٹاٹ، نواڑ، گودڑ وغیرہ کے سے سامان سے بنے ہوئے گول مٹول جوتے نما پھولے پھولے دو خولوں میں پیر گھسائے۔ آگے کو جھکا، بھد بھد کرتا ہموار سڑک کی چڑھائی کو چڑھتا چلا رہا ہے۔ چینی ساخت کے چہرے میں چیاں ایسی آنکھیں حدّت سے سُرخ، چیپڑ میں چپچپاتی، دائیں طرف دور اُفتادہ پہاڑوں کو حسرت سے تکتی ہیں اور پھر نگاہیں سامنے کی سیدھی نہ ختم ہونے والی سڑک پر پیش قدمی میں دوڑتی ہیں۔ اور وسعت کے گرد و غبار میں جذب ہو جاتی ہیں۔

طپش، پیاس، لُو، دھوپ، کبھی درخت اُچک اُچک کر ناچتے ہیں۔ سیدھی سڑک بل کھا کھا کر لہراتی ہے۔ کبھی دھوپ کی تیزی بڑھتے بڑھتے سیاہی میں تبدیل ہو کر دُنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ پہاڑی ڈگمگاتے قدم ڈالتا ہوا رُک جاتا ہے۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیک کر جھکا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ بتدریج تاریکی زائل ہوتی ہے۔ پھر اُسی چُندھیاتی، چلچلاتی دھوپ میں دونوں طرف کے ننگے پت جھڑے درخت کبڈی کھیلتے اور سڑک سانپ ایسے بل کھاتی نظر آتی ہے۔ اور ساتھ ہی کچھ آواز سنائی دیتی ہے غیں غیں۔ درختوں کی آواز ہے کہ سڑک کی! درخت بھاگ رہے ہیں۔ دُھنہ، اُدھل اُدھل۔ پھر اندھیرا۔

غیں غیں۔ شاں۔ رِچ، زرد رنگ کا بیوک کار تین فٹ پر رُک گیا "مرا سالا، لُو لگ گئی" موٹر ڈرائیور نے ذرا اُچکے سے کہا۔

شیں شیں، چھن چھن۔ چھن چھن۔ شیں شیں۔ چھن چھن۔ ریڈی ایٹر کا پانی بولا۔

"ہٹاؤ۔ ہٹاؤ۔ جلدی کرو" اشتیاق علی صاحب قریشی رئیسِ بدایوں نے حکم دیا۔

کھڑکی کھول جلدی سے ڈرائیور کُودا۔ ڈھٹیال کے پاس جا کر اُسے

سڑک کے کنارے ڈھکیلنے کے بعد آگیا۔
ڈگمگاتا سنبھلتا ہوا ڈھٹیال اپنی زبان میں کچھ کہتا ہوا قریشی صاحب کے پاس سے گزرا۔ انھوں نے نفرت مائل مذاق میں کہا "کیوں بے؟"
ڈرائیور نے رنیگتی موٹر کو روک لیا۔ وہ سمجھا کہتے ہیں ٹھیرو۔ ڈھٹیال سمجھا اس کو بلاتے ہیں۔ پاس آگیا۔

قریشی صاحب:۔ کیوں بے کیا ہے؟

ڈھٹیال:۔ (سانس پھولی ہوئی) پانی۔ پانی شاب۔

قریشی صاحب:۔ (پیروں میں رکھے ہوئے تھرماس اور جس پوش صراحی کو دیکھتے ہوئے) احمد ٹین میں پانی ہے۔ دیدو اس کو۔

احمد:۔ (شوفر) پانی ہوتا تو ریڈی ایٹر میں ڈالتا۔ کھول رہا ہے (ٹین کو پیر سے ہلا کر) کچھ تو ہے۔ اس کے پینے بھر کو ہو جائیگا۔

احمد نے پٹرول کا ٹین جس میں پانی تھا، اٹھا کر ڈاٹ نکالی۔ اور اندر ہی بیٹھے بیٹھے باہر جھک کر ٹین کو ٹیڑھا کیا اور آواز دی" او ساکھی۔ لے پانی۔ (قدرے آہستہ سے) کھول رہا ہے۔ سالے کو چار کا مزہ آجائیگا"

ساکھی پر گرم پانی نے آب حیات کا کام کیا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ پانی ختم ہو گیا۔ چلو اور پانی کے انتظار میں منہ سے ہی لگا رہا۔ اور جب معلوم ہوا کہ اور نہیں ہے تو بھیگے ہوئے ہاتھ منہ پر مل کر بولا" ساکھی دلیش جاتا۔ مشکو جانا۔ (قریشی صاحب کی طرف دیکھ کر) مے شلو شاب؟"

قریشی صاحب نے پوچھا" ابے تو چلے گا۔ بڑا شوقین (سیٹ کی طرف اشارہ کر کے) م اس میں بیٹھے گا"

پہاڑی نے فوراً بند ہی دروازے کو پھلانگ کر اندر گھسنے کو پچھلے ہی حصے کے دروازہ پر جہاں قریشی صاحب بیٹھے تھے ہاتھ رکھ اندر کو دنے کیلئے ٹانگ اٹھائی۔ قریشی صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹے اور بگڑ کر بولے:۔

"ارے۔ ارے۔ خبردار۔ ادبے بندر۔ مُنہ لگایا تو سر چڑھنے لگا۔ کیا میری گود میں بیٹھے گا۔ چل اُدھر جا۔ احمد دروازہ کھول دو آگے بٹھالو"، موٹر پھر چل دیا۔

دُور سامنے سڑک کے کنارے پکے کنویں کی جگت پر تیسرا مسافر جوان ہی سہی (لیکن نسل انسان کے ارتقا کی پہلی کڑی) ایک بندریا بیٹھی ہے۔ چھپکلی کا سا بچہ۔ کچے گوشت کا لوتھڑا۔ تین چار دن کا بچہ، سینے سے بجس چپکا ہوا ہے۔ بندریا جگت پر بیٹھی کنویں کے اندر جھانک رہی ہے۔ اس کے چہرے پر نہایت اہم پریشان کن خیالات کا سا گہرا اثر نمایاں ہے۔ کنویں کے اندر ٹھنڈا شفاف پانی جھلملاتا ہوا مسکرا کر اپنے عقب میں تصویر حیرت بتلاتا ہے۔ ایک دوسرے کنویں کا دائرہ ہے اور اس میں ایک دوسری بندریا بچہ لئے جھانک رہی ہے۔ اُدھڑے ہوئے پلستر میں سے چونے کی ایک بہت چھوٹی کنکری بندریا کے ہاتھ سے اندر گرتی ہے ٹپ سے ہوتا ہے۔ سطح آب لہریں لے کر کھلکھلا اُٹھتی ہے۔ نقشِ حیرت ہیجان میں پڑ جاتا ہے۔ پانی۔ پانی۔ بندریا پر پانی کا احساس غالب آتا ہے۔ پانی دسترس سے باہر ہے۔ وہ عجلت کے دو کھروچنوں سے گھبرا کر کنویں کے مونگھڑ پر بیٹھ جاتی ہے۔ چاروں طرف دیکھتی ہے۔

کنویں کی جگت کے نیچے ایک جگہ پر فٹ بھر مٹی نم ہے۔ بندریا کود کر اس پر جا بیٹھتی ہے۔ تر مٹی کو ہتیلی سے چھوتی ہے۔ ناخنوں سے کرید کر تولہ بھر مٹی اُٹھاتی ہے۔ لیکن فوراً ہی اُسے پھینک کر ایک پرانی ماچس کی ڈبیہ جو وہاں پڑی ہوئی ہے اسے اُٹھا کر نوچنے کے بعد پھر کنویں کے کنارے جا کر اندر جھانکتی ہے۔ پانی ہے۔ پانی میں عکس ہے۔ بندریا کی بھویں پہلے انتہائی حیرت کا اثر اوپر کھینچتی ہیں۔ پھر غور و فکر کا اظہار! نیچے سکڑتی ہیں لیکن یہ سب ظاہرا نقشے ہیں۔ حیرت اور استعجاب، دُکھ

اور تکلیف، محبّت اور حسد۔ محبّت اور رشک۔ ضرورت اور جستجو کے جذبات ہیں کمترِ گناہ پیدا کرنے والی چیز، سوچ یعنی تسلسلِ خیال سے دماغ مبرّا ہے۔ جذبات سطحی ہیں۔ افعال حسِّ حیوانی کے تابع ہیں۔

'شاں' کر کے موٹر آیا۔ کھچ سے رُک گیا۔ ریڈی ایٹر کا پانی کھول رہا ہے۔ شیں شیں۔ شیں شیں۔ چھن چھن۔ چھن چھن۔ شیں شیں۔ چھن چھن چھن۔ بندریا دو پھلانگوں میں پاس کے پاکھر (درخت) تک پہنچ ایک ہی جست میں اُوپر کے ٹہنے پر اُچک، کچھ دیر موٹر کو کھیسیں دکھاتی ہے۔ اور جب اس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا تو کنویں کی طرف آدھی پیٹھ موڑ کر اُن سے بے واسطہ ہو کر مطمئن، سنجیدہ اور متفکر چہرہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔

"اُٹھ بے اُٹھ!" احمد نے موٹر سے باہر کُود کر ڈھیٹال سے کہا اور دو تین دھکوں کے بعد اسے اونچا کر کے سیٹ کے نیچے سے پتلی سُتلی نکال کر ٹین میں باندھ کے کنویں پر گیا۔ پانی بھر کر نکالا۔ ریڈی ایٹر میں ڈالنے لگا۔ ڈھیٹال نے جو یہ دیکھا بیتابانہ اپنے کو سمیٹتا، اپنے کو کھینچتا اسٹیرنگ گیئر اور لیوروں میں سے اپنے اُلجھنے والے چیتھڑوں کو سُلجھاتا موٹر سے باہر نکل احمد کے پاس چُلو منہ سے لگا کر بیٹھ گیا۔ "شاکھی پانی، شاکھی پانی!"

ساکھی احمد نہایت اطمینان سے ریڈی ایٹر میں پانی بھرتے رہے۔ یہاں تک کہ ٹین خالی ہو گیا۔ تو وہ پھر کنویں پر گیا۔ ڈھیٹال بھی ساتھ ساتھ گیا۔ جگت کے نیچے چلّو لگا کر بیٹھ گیا۔ "شاب پانی، شاب پانی!" احمد ٹین بھر کر ڈھیٹال کو وہیں چھوڑ کر موٹر کی طرف چلے تو قریشی صاحب موٹر میں سے بولے "ارے پلا دو۔ پہلے اسی کو پلا دو!" لیکن منہ چڑھے ڈرائیور نے فکر نہ کی۔ پانی ریڈی ایٹر میں ڈالنے لگا۔ ڈھیٹال پھر اُن کے پاس آ گیا۔ آدھے

کچھ کم ٹین بچا ہوگا۔ ریڈی ایٹر منہ تک بھر گیا۔ تو احمد نے پہاڑی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے چُلّو لگا کر بیٹھ گیا اور اس قدر پانی پیا کہ ٹین خالی ہوگیا۔ احمد نے کہا "سالا پیتا ہی چلا جائے گا" سالے نے اور پانی مانگا۔ احمد نے تیسرا ٹین بھرا اور پھر پلایا۔ جب ڈھٹیال سیر ہوگیا تو ٹین میں کا پانی وہیں گرا کر احمد اور وہ دونوں موٹر میں آگئے۔ اور موٹر بھنبھنا کر اور گنگنا کر ایک دفعہ پھر گرد آلود سڑک پر اور زیادہ گرد اُڑاتا ہوا سپاٹے بھرنے لگا۔

موٹر کے ہٹتے ہی درخت سے کُود کا دبندریا اس جگہ آگئی جہاں بچا ہوا پانی پھینکا گیا تھا۔ جو کہ قریب قریب سب ہی پیاسی زمین جذب کر چکی تھی۔ صرف پیالی سوا پیالی پانی ہتیلی بھر کے گڑھے میں باقی تھا۔ اسی پر اگلے دونوں ہاتھ ٹیک کر جُھک گئی۔ تھوڑا سا پانی پی کر زمین پر ہاتھ ٹیکے ہی ٹیکے سیدھی ہوئی۔ سر جُھکا کر اپنے بچے کو دیکھا اور پھر پانی پر جُھک گئی۔ پانی ختم ہوگیا تو پھر ویسے ہی اٹھی۔ ایک ہاتھ اُٹھا کر ٹھوڑی کے تر بالوں کو کھسوٹا اور پھر جھکی اور پھر سیدھی ہوگئی۔ پانی اب نہ تھا۔ کیچڑ پر آہستہ سے ہتیلی رکھی اور تر ہتیلی چاٹ لی۔ دو چار مرتبہ یہی کرنے کے بعد سینے پر چمٹے ہوئے بچے کو جلدی سے ایک ہاتھ سے تھپکی دے دُم اونچی اُٹھا درختوں کے نیچے نیچے سڑک کے کنارے کنارے چل دی۔

اتنے عرصے میں گرمایا، بھنّایا ہوا موٹر لُو کے تھپیڑوں سے لڑتا بھڑتا گرد میں خود لپٹتا، گرد اُڑاتا۔ راہ چلتوں پر غیں غیں غُراتا، میلوں کو چباتا کوسوں نکل گیا تھا۔ دُور سڑک کے دونوں طرف پتھر کی منُعدد چار دیواریاں اور چند مکان کاٹھ گودام کی قُربت ظاہر کر رہے تھے۔ پہاڑوں کے پھیلے ہوئے دامن جو پہلے دُھندلے، سیاہ تھے اب سبز درختوں کا لبادہ پہنے نظر آنے لگے۔ دو چار بیل گاڑیاں اور گاہ بگاہ چند اُجڑے ہوئے راہگیر

بھی سڑک پر ملنے لگے۔ یہاں تک کہ نیچی نیچی احاطہ کی دیواریں اُن کے اندر کیلے اور پپیتے کے درخت اور درختوں کی آڑ میں مکان یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ حتیٰ کہ موٹر کاٹھ گودام شہر میں اور پھر بازار میں سے ہو کر گذرا۔ یہاں موٹر نے بہت سے اپنے ہم جنسوں کو دیکھا۔ جن میں کہ لاری قوم کے افراد زیادہ تھے۔ مگر ہمارا موٹر بازار میں سے ہوتا ہوا کئی پٹرول کی دُکانیں چھوڑتا ہوا بغیر رُکے آخری پٹرول پمپ کے پاس جا کر رُک گیا۔ یہ دُکان شہر کی آخری شمالی دُکان تھی۔ جہاں سے آگے اب باقاعدہ چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ موٹر روک کر احمد اُترا۔ رومال سے منہ کی خاک پونچھی پھر ڈھٹیال کو دھکیل دھکیل کر نیچے اتارا۔ اُس کو لُو لگ چکی تھی۔ بدن پُھک رہا تھا۔ سینے میں آگ لگی تھی۔ وہ بیچارہ کچھ اور سمجھا۔ چلو لگا کر پانی کے واسطے بیٹھ گیا۔

احمد: "واہ بیٹا مزے میں آ گئے" آہستہ آواز میں کہتے ہوئے موٹر کا پٹرول ناپنے لگا۔ پٹرول دینے والا آ گیا تھا۔ چار گیلن پٹرول موٹر میں ڈلوا کر نہایت احتیاط سے پمپ کی موٹی ربڑ کی نلکی کو سُوتنے لگے۔ پمپ والے آدمی نے ڈھٹیال کو غور سے دیکھ کر دبی زبان میں احمد سے پوچھا "اسے کہاں سے پکڑ لائے"

احمد نے کہا "زبردستی سالا سر پڑ گیا۔ صاحب نے بٹھا لیا ہے۔ پانی ہو تو لا کر پلا دو۔ سالا مر رہا ہے" اس کے بعد قریشی صاحب کے پاس آیا۔ پوچھا "کچھ چاہیے؟" صاحب نے اشارہ کیا۔ احمد نے نہایت احتیاط سے صُراحی میں سے پانی اور تھرماس میں سے برف ملا کر صاحب کو پانی دیا۔ پھر خود موٹر کی آڑ میں پانی پی کر صراحی اور تھرماس کو اپنی جگہ پر رکھ، بچی ہوئی برف کی ڈلیاں اس گال سے اس گال میں گھماتا ہوا اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ڈھٹیال کے واسطے بھی پانی آ گیا تھا۔ جب وہ پی کر آ گیا تو پوچھا

"کہاں جائے گا؟" معلوم ہوا بیر بھٹی۔ صاحب نے کہا "بٹھا لو، کیا ہرج ہے"

احمد نے سلف اسٹارٹر پر پیر رکھا۔ موٹر گنگنا کے پھڑپھڑایا اور آگے کو رینگا۔ لیکن فوراً ہی لاغر صورت، پریشان بال، جھبری ڈاڑھی کا ایک نوعمر آدمی، سیدھے ہاتھ میں پنسل، اُلٹے ہاتھ میں بہت بڑا رجسٹر لئے موٹر کے آگے آیا۔ گاڑی روک لی گئی تھی۔ ریڈی ایٹر کی طرف جھکا۔ غور سے اُسے دیکھا۔ ہی ہی، ہی ہی کر کے ہنستا ہوا سیدھا ہوا۔ پنسل اور رجسٹر آگے بڑھا کر نہایت صاف انگریزی میں گویا ہوا Now then my Lord لیکن کسی جواب کا انتظار کرنے یا اس سے آگے کچھ کہنے کی کوشش کرنے کے بغیر وہ پھر ریڈی ایٹر کی طرف جھکا۔ اس کے وسط میں غور سے دیکھنے کے بعد پھر ہنسا اور پھر وہی کہا۔

احمد اور قریشی صاحب دونوں نے پریشان ہو کر کہا "آپ کیا چاہتے ہیں، تم کون ہو؟"

اب اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا There is my card اور پھر بغیر کارڈ نکالے گویا ہوا "آپ انگلش میں سوچتے ہیں یا اُردو میں!"

قریشی صاحب تو چُپ ہی رہے۔ احمد نے جلدی سے جواب دیا۔ "اُردو میں بات کیجئے اُردو میں۔ آخر مطلب کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا "بہتر ہے۔ اُردو ہی میں سہی۔ میں آج آپ کو تفکرات انسانی کے ارتقائی مراحل کا زندہ اور جاوید نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ گو میں نے تمام دُنیا کے انفرادی اور اجتماعی وسوسات اور احساسات کا تنقیہ، تزکیہ اور تبصرہ اس رجسٹر میں نقش کالحجر کر لیا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے مُحترم و معظم سامعین کی خاطر یہ خاکسار یعنی پروفیسر دیا شنکر دوبے

متخلص وجد جو بتمام عجز و انکساری اس وقت مُعزز مجمع کے آگے حاضر ہے۔ فلسفۂ ریڈی ایٹر کو انہماکِ خیال میں تنقیح دیگر بتائے گا"۔ یہ کہتے ہوئے پھر وہ ریڈی ایٹر کی طرف جھکا۔

احمد نے کہا "الٰہی توبہ یہ کون صاحب ہیں"۔ قریشی صاحب حیرت زدہ خاموش تھے کہ اتنے میں پٹرول پمپ والا دوڑا۔ اور آتے ہی پروفیسر صاحب کو دھکے دیکر موٹر کے سامنے سے ہٹا کر بولا "جلدی نکال لو۔ پاگل ہے پاگل"۔ احمد نے موٹر بڑھایا اور جب پروفیسر صاحب کے برابر سے گذرا تو قریشی صاحب نے دیکھا کہ وہ جسم کے صرف بالائی حصے پر کپڑوں کا استعمال روا رکھتے تھے۔ ٹانگیں دھوتی، پاجامہ یا پتلون کے احسان سے شرمندہ نہ تھیں۔

موٹر پھر روانہ ہوا۔ ایک فرلانگ سیدھی چڑھائی پر دوڑنے کے بعد بائیں طرف گھوما۔ سَو قدم سیدھا چلا اور پھر دائیں کو چلا۔ اب باقاعدہ چڑھائی کی بل کھاتی، لہراتی، ہر ہر قدم اُوپر کی طرف جاتی سڑک شروع ہوگئی۔ موٹر نے دو چار چکر اور کاٹے ہونگے کہ ایک دفعہ گنگناتا ہوا پھر جو گھومتا ہے تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جاں بخش جھونکا آکر موٹر کی بلائیں لیتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اور پھر دوسرے ہی موڑ پر پُل سے گذرتے ہی مُتعدد اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ ان کے بعد اور۔ اور ان کے بعد اور۔ لو ایک ہی منٹ میں رُت بدل گئی۔ منظر بدل گیا۔ جان میں جان آگئی۔ چڑھائی پر ابھی جب روانہ ہوئے تھے تو سیدھے ہاتھ پر چوڑے نالے کی خشک تلی میں، ریتے اور بجری میں بوئے ہوئے جھلستے ہوئے بڑے بڑے پتھر، دھوپ میں چمکتے ہوئے آنکھوں کو پتھراتے تھے۔ دوسری طرف آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ کی دیوار سے لپٹیں نکل

رہی تھیں۔ اس پر لگی ہوئی زندہ اور مُردہ سبز اور بھوری گردیں تپتی ہوئی جھاڑیاں گرم آہیں بھر بھر کر گرد اُڑانے والی موٹروں کو کوستی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ سب منٹوں میں بدل گیا۔ تر و تازہ مست جھومتے ہوئے درختوں، شاداب مُسکراتی ہوئی جھاڑیوں، نم ڈھالوں اور ٹپکتی ہوئی چٹانوں کے درمیان موٹر بھاگنے لگا۔ سڑک بل پر بل اور گنڈلیوں پر گنڈلیاں کھاتی، نکلے ہوئے دامنوں پر سے صدقے ہوتی۔ دھنسی ہوئی کھوؤں کی بلائیں لیتی، ہر ہر قدم پر رُخ بدلتی، سیاہ دیوارِ کوہ پر ہلکی بھوری لکیر سی نظر آنے لگی۔ اور موٹر بھنبھناتا ہوا چھوٹا سا زرد بھونرا معلوم ہونے لگا۔

موٹر کی ان ہر دم چکّر گھُمیریوں سے جس میں کہ انسان کا خود بھی آزو بازو جھُکتا رہتا ہے، اکثر آدمیوں کا جو عادی نہیں ہوتے سر گھومنے لگتا ہے اور استفراغ ہو جاتا ہے۔ بیچارہ ڈھٹیال سب سے پہلے سب سے پہلی سواری پر اسی موٹر میں بیٹھا تھا۔ اور گو ٹھنڈی ہوا سے ہوش و حواس آ گئے تھے۔ لیکن پیٹ میں بھرا ہوا ڈھائی کنستر پانی اس ہلچل سی بھونچال میں آیا ہوا۔ سر کے چکّروں کا پھسلایا ہوا، مُنہ کے ذریعے واپس نکلنے کے واسطے طوفان مچائے ہوئے تھا۔ ڈھٹیال کو اس لذّت سے بھی پہلی ہی دفعہ شرف حاصل ہوا تھا۔ جونہی مُنہ بھر پانی پہلی اُبکائی کے ساتھ نکلا اس نے مزید احتیاط کے واسطے دونوں ہاتھوں سے دبا کر اپنا گلا پکڑ لیا۔ لیکن اس حرکت نے صرف اتنا ہی کیا جو کھُلی ہوئی سوڈے کی بوتل پر ہتیلی رکھ دینے سے ہوتا ہے۔ گھُٹ گھٹا کر بھر پور ہے زور سے نکلا تو منہ کے پانی کی دھار سامنے کی گھڑیوں، میٹروں اور لیوروں پر پڑتی چلی گئی۔

احمد نے فوراً موٹر روک کر مگا درست کیا۔ پھر اسے ناکافی سمجھتے ہوئے جھک کر موٹر کا پمپ اُٹھایا۔ وہ ضرورت سے زیادہ شدید معلوم ہوا تو

اسے بھی پھینک اب ایک ہاتھ ماتھے پر اور دوسرا اسٹیرنگ گیئر پر رکھ بے بسی کی تصویر بن کر بیٹھ گیا۔ قریشی صاحب کسی سوچ میں تھے چونک کر ڈپٹے "کیا بات ہے جی!"

احمد نے روتی ہوئی آواز میں جواب دیا "قے کر رہا ہے"

قریشی صاحب:۔ ارے۔ ارے یہ کیا۔

احمد:۔ آپ نے بھی کیا بیکار کی بلا پالی۔ سالے نے سب نجس کر دیا توبہ توبہ! میرے پیر بھی سن گئے۔

قریشی صاحب:۔ اُتارو۔ اُتارو۔ اُتار دو۔

احمد:۔ اُتر سالے، اتر۔

جس جگہ ڈھیٹال کے بار سے سبکدوش ہونے کیلئے موٹر روکا گیا تھا وہیں پر ایک جگہ بہت چھوٹا سا چشمہ چٹانوں میں سے نکل کر جنگلی اسٹابریوں میں بل کھاتا، کسی مردِ خدا کے کھوسے ہوئے گھگوار کے پتّے پر سے دھار کی صورت میں سڑک کے کنارے کی نالی میں گر رہا تھا۔ احمد نے اس ہی میں سے پانی بھر بھر کر کچی اور پکی اسٹابریاں کھاتے اور تھوکتے ہوئے موٹر کو دھو کر صاف کیا۔ ادھر سڑک کے دوسری جانب انتہائی مخدوش کھڈ کے کنارے ڈھیٹال بھی پاجامہ کھسکا کے صفائی میں مشغول ہوئے۔ قدرت بہ سر امداد تھی۔ ہر رستے سے لُو کی گرمی نکلنے لگی۔ بول و براز اور استفراغ سب ہی جاری ہو گئے۔ اور اسی حالت میں اُن کو چھوڑ کر موٹر روانہ ہو گیا۔ اور موٹر کے روانہ ہوتے ہی جناب اشتیاق علی قریشی رئیس بدایوں کے دماغ سے ہمیشہ کے واسطے ڈھیٹال کا خیال بھی اپنے آپ جُدا ہو گیا۔ البتہ مانگ پٹی والے چکنے چیڑے، اُترن کی ریشمی قمیص پہننے والے میاں احمد ڈرائیور کچھ دیر تک ڈھیٹال اور اس کی ماں بہنوں کو زیرِ لب یاد کرتے رہے۔ اور پھر وہ بھی بھول گئے۔ موٹر نینی تال کے میل ۱۹ پر پہونچ گیا تھا۔ سانئ سینٹ

کے پُل کے پار جہاں سڑک قدرے چوڑی ہے وہیں سے ایک راستہ اور نکل کر دو چار بل کھاتا چیڑھ کے درختوں میں ہوتا ہوا سو فٹ کے قریب اور اُوپر چڑھ کر قریشی صاحب کے بنگلہ میں پہونچ جاتا ہے۔

دُوسرا باب

موٹر کے بیٹھنے والے سنسناتے ہوئے منٹوں میں پہاڑ پر پہنچ گئے۔ لیکن ہماری بندریا ابھی سڑک کے کنارے درختوں کے نیچے نیچے جا رہی ہے رفتار سست بھی پر دُم تنی ہوئی ہے۔ اور چونکہ ہر ہر قدم پر ایسی عجائبات قدرت سامنے پڑ جاتی ہیں جیسے کہ پی ہوئی بیڑیوں کے سرے۔ کاغذ کے ٹکڑے، کپڑوں کی دھجیاں اور درختوں کی جڑوں میں مکڑی کے جالے وغیرہ لہٰذا ان کے معائنے اور مشاہدے میں اور بھی زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ پھر ان ہی چیزوں پر موقوف نہیں، سڑک کے درختوں میں جامن آم اور نیم کے بھی مُتعدد درخت موجود ہیں۔ جن میں کہ مرتا ہوا بور اور بڑھتے ہوئے پھل بھی موجود ہیں۔ بندریا کیلئے ان کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے۔ غرضیکہ اطمینان کے سفر اور ان مشغلوں میں بہت جلد شام ہونے لگی۔ ایک جگہ کھٹی جامنیں اور کھٹی کیریوں کے بعد نیم کی کڑوی نمکولیوں سے بندریا مُنہ کا مزہ بدل رہی تھی۔ کہ ایک تلک دھاری دیہاتی کا گذر ادھر سے ہوا۔ اپنا پیٹ کاٹ دو مُٹھی چنے بندریا کے واسطے سڑک کے کنارے سرے کی جڑ کے پاس رکھ خاک اُڑاتے چنے پھانکتے چل دیئے۔ بندر نے لو کی گرمی، نمکولیاں اور سوکھا بور بیتا چھوڑ سرے کی طرف دوڑ کی۔ دو مُٹھی بُھنے ہوئے چنوں کی ڈھیری ان ہی کیلئے حاضر تھی۔ بھوبن شواد شٹ تھا۔ دونوں ہاتھ چلنے لگے۔ جلدی جلدی اِدھر اُدھر سر گھما کے دیکھنا اور

دونوں ہاتھوں سے چنے اُٹھا اُٹھا کر منہ میں رکھنا شروع کر دیا۔ چنوں کی ڈھیری غائب ہونا اور بندریا کے دونوں گالوں میں دو غدود اُبھرنا شروع ہو گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ غدود بڑھتے بڑھتے تھیلوں کی طرح لٹک پڑے۔ چنے اب ختم ہو چکے تھے۔ اکّا دُکّا جھانکتے ہوئے یا چھپے ہوئے دُھول میں باقی تھے۔ اور بندریا کبھی سیدھے اور کبھی اُلٹے ہاتھ سے مٹی کو منتشر کر کے ان ہی کو چن رہی تھی کہ ایک راہگیر اور آتا ہوا نظر آیا۔

گو یہ مسافر قد میں بندریا سے کچھ زیادہ بڑا نہ تھا۔ لیکن تھا انسان اور بڑے ٹھاٹ کے ساتھ تھا۔ سر پر چار بل کھائے موٹے گاڑھے کا صافہ، پیروں میں چونچیں اُٹھائے، ایڑیاں لچکائے، کچے چمڑے کا جوتہ۔ کسی اور کھسی ہوئی دھوتی باندھے۔ آنکھوں کی قربت میں آدھے مُنہ پر کاجل لگائے ٹپکنے پر آمادہ ضدّی رینٹا، پیہم سڑپتا، ایک ہاتھ میں سینٹا لئے دوسکر ہاتھ سے سر پر کی چھوٹی پٹلیا تھامے بندریا پر نگاہیں جمائے ٹھٹکتا چلا آ رہا تھا۔ جب بندریا اس کی طرف دیکھے تو رُک جائے۔ اور جوں ہی وہ چنے چُننا شروع کرے تو وہ رُک جائے۔ اسی طرح کرتے کرتے بندریا کے برابر آ گیا۔ اب بندریا نے سر اُٹھا کر لڑکے کو غور سے دیکھا۔ لڑکا رُک گیا، سینٹا اُٹھایا۔ بندریا نے آزمانے کے خیال سے ایک قدم اس کی طرف بڑھی۔ لڑکا گلا پھاڑ کر چلّایا "ہو دادا، دادا ہو دادا" اب کیا تھا معلوم ہو گیا۔ لپک کر بندریا اس کے پاس پہونچی۔ لڑکے کی گھگّی بندھ گئی "ہے ہے ہے ہے" بندریا نے ہر ہر قدم پر بھبکی دینے کے تین تین چار چار ڈنڑ پیلتے ہوئے ایک ایک قدم آگے بڑھنا شروع کیا اور لڑکا "ہے ہے ہے ہے" کرتا اور سینٹا اپنے آگے ہلاتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی گڑبڑ میں سر پر کی پوٹلی ایسا معلوم ہوا کہ اپنی نشست پر سے ڈر کر بھاگی

سڑک پر لڑھکنے لگی۔ بندریا پوٹلی کی طرف دوڑی اور اسے پکڑا، بہنگی بدوش دادا، جن سے اس شد و مد کی امداد طلب کی گئی تھی بہنگی بیچ سڑک پر چھوڑ ٹیکن کی چڑیا دار لکڑی ہاتھ میں لئے "اے تور بہنیاں، اے تور بہنیاں" کرتے ہوئے بھاگے۔ بندریا نے ایک ہاتھ میں پوٹلی پکڑلی۔ تین ہی ٹانگوں پر اچکتی درخت تک بھاگی۔ لمحہ بھر نیچے جست کے واسطے رکی اور پھر، ایک دو اور تین ہی چھلانگوں میں درخت کی سب سے اونچی ڈال پر بیٹھ گئی۔ اور حالانکہ دادا درخت کے نیچے کھڑے "اے تور بہنیاں" کا وظیفہ اور لکڑی کے چڑیا دار سرے کی گردش بڑے ہی زور شور سے فرماتے رہے۔ لیکن چوٹی کے اوپر بیٹھی ہوئی بندریا پوٹلی کو نوچ نوچ کر اس میں کی اشیائے خوردنی اس طرح کھاتی رہی جیسے اس سے کوئی مخاطب ہی نہیں ہے۔ اور ادھر کچھ دور سڑک کے بیچوں بیچ رکھی ہوئی بہنگی پر، نہ معلوم کہاں سے نکل ایک لال بچھاوے والے جغادری بندر صاحب نہایت اطمینان اور انہماک سے مصروف ہو گئے۔ گویا بہنگی ان ہی کی ہے۔ اور آپ ٹوکرے میں آدھے دھڑ سے اندر جھکے ہوئے کسی ضروری چیز کی تلاش کر رہے ہیں۔

فلک آشیانی بندریا کو چھوڑ، دادا صاحب اب بہنگی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جب جغادری سے اپنی بہن کی شان میں ہتک آمیز جملے برداشت نہ ہو سکے تو انھوں نے بھی جلدی میں جو بھی ہاتھ پڑا لے، تین ٹانگ پر اچکتے ہوئے ایک دوسرے درخت پر آسن جمایا۔ اور چونکہ ان کے حصے میں بمبا کو کی پوٹلی آئی تھی، اس لئے بڑی دیر تک سونگھ سونگھ کر بمبا کو نیچے ٹپکاتے رہے۔ یہاں تک کہ بہنگی، دادا، اور تین فٹے پوتے نظروں سے غائب ہو گئے۔ اور جب بندر اور بندریا دونوں اپنی اپنی پوٹلیوں سے فارغ ہو گئے تو بندر تیزی کے ساتھ اور بندریا ڈرتی ہوئے

آہستہ آہستہ اپنے درخت سے نیچے اُترے۔ اور بھبکیا کر بندر بندریا پر جھپٹا۔

دراصل یہ بندر کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اسی بندریا کا بندر ہے اور انہیں کے لختِ جگر بندریا کی گود میں ہیں۔ لیکن چونکہ یہ صاحب وسیع خرچ شوقین طبع، خاندانی بندر ہیں۔ آپ کی دس بارہ بیویاں اور ہیں۔ یہ سب ایک دو بکرا اور بندر کی ٹولی کے سب کے سب مل کر بغرضِ سیر و تفریح اور تبدیل آب و ہوا گرمیوں میں پہاڑ پر جا رہے ہیں۔ اور دورانِ سفر میں بندریا کے بے موقع زچہ خانہ کی وجہ سے اسے تنہا چھوڑ کر ہی آگے بڑھ جانا پڑا تھا۔ اور چونکہ بندروں کی اس ٹولی کی رفتار بہت کم تھی (جیسا کہ ہونا چاہیے) اس لئے بندریا زچہ خانہ، چھٹی چلّہ سب سے ایک ہی ساتھ جلد فارغ ہو، پھر روانہ ہوگئی تھی اور اب ٹولی کے پاس آگئی تھی جس سے کہ کچھ دور پر ٹہلتے ہوئے بندر سے اب مُلاقات ہوگئی تھی۔

جناب چودھری صاحب ان سے بے حد خفا تھے۔ ان کی شکایتیں بھی جا سے تھیں۔ بے وقت کا زچہ خانہ، پیچھے رہنا، دیر میں آنا وغیرہ وغیرہ۔ خوخیاتے، بھبکیاتے پہونچے اور بُری طرح بندریا کی خبر لی۔ انتہا یہ کہ دُم پکڑ پکڑ کر کھینچی (جو کہ انسانوں میں عورت کی چوٹی پکڑ کر کھینچنے کے برابر ہے) بندریا نے سب ہی طرح معافی مانگی۔ ہاتھ جوڑے، اپنی مجبوریاں پیش کیں، اپنے عُذر بیان کئے۔ لیکن کس طرح سے، بولی اور لفظوں میں نہیں۔ جھرجھریاں لیں، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر فی فی فی کی۔ اور جب بھی ظالم بندر کو رحم نہ آیا تو چاروں ہاتھ پیروں کو سمیٹ پیٹ کے بل زمین پر لیٹ، مُنہ اونچا کر، دونوں باچھیں کانوں تک پھاڑ کچ کچ۔ کچ کچ۔ فی فی۔ کچ کچ۔ کچ کچ۔ فی فی کرنے لگی۔ اور جب (اللہ کی پناہ) دُم کھینچی گئی۔ پیشاب خطا ہوگیا (مار بُری چیز ہے) خیر بہزار خرابی بندر

صاحب کا غصہ جو رہ رہ کے واپس پلٹتا تھا، دفع ہوا۔ اور جب دونوں میں کچھ میل ہوگیا تو بندر کے پیچھے پیچھے بندریا اس طرف روانہ ہوئی جہاں بندروں کی ٹولی نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

سڑک سے سوگز کے فاصلہ پر، نالے کے پار چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور معمولی قد کے درختوں سے گھرا ہوا برگد کا شاندار پیڑ جٹیں اور ڈاڑھیاں لٹکائے بڑے تنے کے علاوہ دس بلیں اور ستونوں کا سہارا لئے، گہرے سبز پتوں کا سایہ کئے کچی پکی برگدیوں سے لدا ہوا دو منزلہ، سہ منزلہ۔ عالی شان محل سا کھڑا ہے۔ اور اس میں بندر لوگوں کا قیام ہے۔

کیا چہل پہل ہے۔ کیسی رونق ہے۔ کیا زندہ دلی ہے۔ برگدیاں کھائی جا رہی ہیں۔ کھیل کود ہو رہے ہیں۔ کہیں ورزش ہو رہی ہے، کشتی لڑی جا رہی ہے۔ جھولا جھولا جا رہا ہے۔ دوسرا برابر کی ڈالی سے اُچک اس کے پیر پکڑ اس سے نیچے پیروں میں لٹک جاتا ہے۔ لو ایک کے اوپر دوسرا دونوں جھول رہے ہیں۔ اوپر والا ڈالی چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں گدا بد نیچے گرتے ہیں۔ اور گرتے ہی اُٹھ کر بھاگتے ہیں۔ کوئی کسی کو نوچ کر بھاگا ہے، وہ اس کے پیچھے دوڑا ہے۔ یہ ڈال ڈال ہے تو وہ پات پات ہے۔ ایک صاحب موٹے ڈگالے پر چت لیٹے دونوں ہاتھ سر کی طرف پھیلائے ہوا کھا رہے ہیں۔ (کروٹ لیں تو نیچے) ایک بندریا بندر کی جوئیں پا رہی ہے۔ بندر صاحب ہاتھ سر کی طرف پھیلائے بغل کھولے بیٹھے ہیں۔ بندریا کا مُنہ پلخ پلخ چل رہا ہے۔ وہ ایک جوئیں اصلیت میں اور سینکڑوں تصور میں کھا رہی ہے۔ ایک اور بندریا ان کو رشک سے دیکھ کر آہستہ آہستہ قریب آگئی ہے۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر بندر کی پیٹھ چھوتی ہے۔ دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کو بھی یہ شرف حاصل ہو

سکتا ہے۔ لیکن نہیں۔ بندر لیٹے ہی لیٹے خوخیاتا ہے۔ معتوب جورو اُچک دُور ہو بیٹھتی ہے۔ مدّنظر لاڈلی اپنچ بھر اور قریب کھسک دُگنی تیزی سے پلخ پلخ مُنہ چلانے لگتی ہے۔

دو بچوں نے بازی بدی ہے اکُشتی لڑ رہے ہیں۔ ماں پاس بیٹھی موزہ بُن رہی ہے۔ ارے توبہ! ہئے کا گھونسلا نوچ رہی ہے۔ اور غرور سے ہونہار سپوتوں کو دیکھ رہی ہے۔ سپوت ذرا کم عمر ہیں۔ دونوں ہاتھ اُونچے کر کے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر لڑنے کو تیار ہوتے ہیں۔ ایک تناسب سے بھاری سر کا جھونک بگڑنے سے اپنے آپ چت گرتا ہے۔ دوسرا اپنی ہی نامعقول دُم کو جو بلا وجہ سامنے آجاتی ہے پکڑ کر کھینچتا ہے اور لامحالہ وہ بھی لُڑھک جاتا ہے۔ ایک صاحب ان دونوں کے سر کے اوپر پیروں سے ڈالی پکڑے اُلٹے لٹکے ہر لمحہ اُن پر گرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اور چونکہ بندر لوگ بھی ہم لوگوں کی طرح زندگی کے صرف چار اہم مقاصد پورے کرتے ہیں۔ یعنی پیدا ہوتے ہیں۔ پیٹ پالتے ہیں، پیدا کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں بھی چند بدنصیب غمزدہ اور مُردہ دل ضرور ہونا چاہئیں۔ اور ہیں بھی۔ ایک بندریا سات دن سے مرا ہوا بچہ دبائے دبائے پھر رہی ہے۔ ابھی بچے کا سر ٹیک پڑا ہے اسے غور سے دیکھ رہی ہے (دل کی کیا حالت ہوگی) ایک بوڑھی بندریا جس کے بہت سے نواسے پر نواسے اس ٹولی میں کھیل کود رہے ہیں برگد کے درخت کے پاس اُکڑوں بیٹھی ہے۔ لمبے ہاتھ گھٹنوں پر ٹکے ہوئے آگے پھیلے ہیں۔ بدن پر چمکتی ہوئی پوستین کے بجائے لمبے اور چھدرے بال بے ترتیبی سے مُنتشر ہیں۔ لٹکی ہوئی بھووں کے نیچے معمول سے کہیں زیادہ اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ یہ گھنٹوں ایک جگہ نگاہیں جمائے اسی

حالت میں بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی سوکھا پتہ ہوا میں تلملاتا اس کے کان کے پاس سے گذرتا ہے تو سر ایک طرف جھکا کر پتے کو گر جانے دیتی ہے اور پھر ویسے ہی بیٹھ جاتی ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں یاں بیزار بیٹھے ہیں

زندگی! پُرعیش و پُرکیف زندگی۔ بچپن کی پُرسحر بے فکر زندگی جوانی مست زندگی۔ کیا تو اسی واسطے عطا ہوئی تھی کہ وقتِ آخر تیری یاد کے تازیانے پُشتِ خمیدہ کی دھجیاں اُڑائیں۔ مگر نہیں، یہ تو میں اپنی حالت لکھ گیا۔ کھُرّی کھٹیا پر بیٹھا۔ حقہ کی نلی مُنہ سے لگائے، ناک پر رکھی عینک کا ڈورا سر کے گرد لپیٹے۔ ہاتھ میں پنسل، سامنے بادامی کاغذ کا رجسٹر رکھے ڈاڑھی کھجا کھجا کر من گھڑت قصے لکھتے لکھتے گھنٹوں کیلئے غائب ہو جاتا ہوں۔ یاد، یاد، بچپن اور جوانی کی یاد۔ گذشتہ زندگی کے نقشے پھر سے کھنچتے ہیں۔ اور اسی سینما کو دیکھتے دیکھتے چونک پڑتا ہوں۔ کھٹیا پر بیٹھا ہوں، حیرت کا قصہ لکھ رہا ہوں۔ بڈھی بندریا کا بیان ہے۔ تو اے بندریا، بڈھی بندریا تو خوش قسمت ہے۔ بُڑھاپے کے جھکے ہوئے ہاتھ پیر دُھندلی آنکھیں، کملایا ہوا دل تجھ کو گھنٹوں اس حالت میں بٹھاتا ہے۔ تو بٹھلائے۔ تیرا دماغ یادِ ماضی سے پاک اور فکر فردا سے مُستغنی ہے۔

بیشک تو خوش قسمت ہے اور میں بدنصیب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چند پیسوں کی اُجرت کے واسطے لکھ رہا ہوں کہ بندر بندریا کو ساتھ لئے ہوئے بندروں کے اس قافلہ میں داخل ہوا۔ فوراً ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جو درخت پر تھے نیچے آ گئے۔ جو نیچے تھے اُوپر چڑھ گئے۔ خوخیانے اور قوقو چلانے میں دو متضاد جذبے، نفرت اور محبت کے اظہار ہر طرف سے ہوئے، اختلاف رائے کی وجہ سے کئی جگہ جنگ چھڑ گئی۔ بچے گودوں میں چھپا لئے،

گئے۔ لیکن جس قدر جلد یہ بدامنی پھیلی تھی اتنے ہی جلد پھر امن اور سکون ہو گیا۔ اور بندریا اپنی ٹولی میں باقاعدہ داخل ہو کر اس ٹولی کا ایک جزو بن گئی۔

اس ٹولی نے اس دن شام تک اسی درخت کی برگدیاں کھائیں، نالے کا پانی پیا اور رات کو یہیں قیام کیا۔ اور دوسرے دن صبح کوچ بول دیا۔ سڑک کو چھوڑ، شمال مغرب میں سب سے قریب نظر آتے ہوئے پہاڑ کی دامن کی طرف بندر لوگ چل دیئے۔ پھل پھول کھاتے، گھونسلے اجاڑتے، ڈالیاں توڑتے، اُچھلتے، لڑتے بھڑتے، خوخیاتے، چلّاتے، روز بروز پہاڑ کے اُوپر ہی چڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دس دن کے بعد پانچ ہزار فٹ اُوپر پہنچکر نینی تال کی سڑک پر میل ۱۸ اور میل ۱۹ کے درمیان اخروٹ کے درختوں میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اتنی اُونچائی کی آب و ہوا بندروں کو ہرگز خوشگوار نہ تھی۔ اتفاقاً یہاں تک آ گئے تھے۔ اور غالباً آتے ہی واپس لوٹ جاتے لیکن کچے اخروٹوں اور نیلی مکوئیوں کی لذّت ان کو چند روز یہاں روکے رہی۔

بارش پہاڑوں کی چوٹی پر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ گاہ بگاہ ہلکے چھینٹے پڑتے رہتے تھے۔ اس واسطے ابھی سردی بھی خوشگوار تھی۔ دن تو بہت ہی پُرلطف تھے۔ البتہ راتوں کو بندروں کے واسطے ٹھنڈی ہوا کی جھونکے کبھی کبھی تکلیف دہ ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ لوگ سکڑ سکڑا کوں کوں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے اس قدر چمٹ کر بیٹھ جاتے تھے کہ کافی بچاؤ سا ہو جاتا تھا اور اسی طرح صبح ہو جاتی تھی۔ پھر صبح ہوتے ہی سورج کی گرم کرنوں میں رات کی تکلیفیں بھول کر پُرفضا پہاڑوں کی سیر و تفریح میں لگ جاتے تھے۔ اس منت کن آب و ہوا نے بندروں کو جو بہت ہی زندہ

دل ہوتے ہیں، اور بھی زیادہ زندہ دل کر دیا تھا۔ ہر ایک خوش و خرّم تھا۔ ہر ایک کے دل میں شرارتوں کی گدگدیاں رہ رہ کے پیدا ہوتی ہیں یہاں تک کہ بُڑھیا میں بھی زندگی کی ہلکی سی لہر پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی کسی ڈھال پر بیٹھے بیٹھے ایک آدھ پتھر لڑھکا کر اس کا دور تک لُڑھکتا چلا جانا اور لُڑھکنے میں متعدد اور چھوٹے بڑے پتھروں کا اپنے ساتھ شریک کر لینا دیکھا کرتی تھی۔ ادھر ہماری بندریا کا نوزائیدہ بچہ جس کو ہیں نے کنوئیں اور سڑک پر گھنٹوں ایک ہی تھن مُنہ میں دبائے بھیں سینے سے چمٹا دیکھا تھا۔ پہلے پہلے تو کچھ ہُشیار سا ہو گیا۔ اور اب تو ماں کی گود سے اُتر کر کچھ کچھ اُچکنے اور پھُدکنے بھی لگا ہے۔ لیکن ہے ابھی بہت چھوٹا۔ ہر عضو تناسب سے الگ ہے۔ بہت بڑا سر۔ ذرا سا ہنڈخی ایا پیٹ، اس میں چار ہاتھ پیر ایک دُم۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ سینٹے لگے ہوئے ہیں۔ جھریوں دار لال لال مُنہ میں سُرمہ دار آنکھیں۔ سر پر مانگ نکلی ہوئی۔ ایک دفعہ دودھ پیتے پیتے ماں کی گود سے کُود کر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے۔ ماں جو کہ سڑک کی نالی سے تین فٹ دور پڑے سے پتھر کے نیچے بیٹھی اس کی جڑ میں سے تپتیا چٹر پٹے کے پتے نوچ نوچ کر کھا رہی ہے، بغیر رُخ بدلے دوسرا ہاتھ بڑھا کر بچے کی دُم پکڑ کر پھر اُسے اپنے قریب کھینچ لیتی ہے۔ بڑی دیر سے یہی ہو رہا ہے۔ بندریا کی پُشت کی طرف ڈھال اور ڈھال پر کے پیڑ اور جھاڑیوں پر بڑی دُور تک بندر پھیلے ہوئے پُرامن مشغلوں اور کھیلوں میں مصروف ہیں۔ ان میں سے ایک سیانا بچہ، کئی دفعہ بندریا کے پاس آ کر اُس کے بچے کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے بہکا کر لے جانے کی کوشش کر چکا ہے اور آخری مرتبہ کی اس حرکت پر بندریا نے کئی بھبکیاں دیکر اُسے ذرا دھمکا بھی دیا ہے۔ مگر یہ کب مانتا ہے۔ پھر چُھپکے چُھپکے بندریا کی پیٹھ کے پیچھے بڑھ رہا ہے۔ متانچہ دو پیروں پر کھڑا اماں کے کندھے پر سے اُس آوارہ چھوکرے

کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ دوستی کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ ماں کے کندھے پر چڑھنے کو اُچکتا ہے اور ناکامیابی کی وجہ سے بغل کے نیچے سے نکل کر چھوٹی چھوٹی پھُدکیاں لیتا ہوا بندر کے لونڈے کی طرف بڑھتا ہے۔ ماں چڑبڑا نوچتے نوچتے گو دخالی پا کر ایک دفعہ گھوم پڑتی ہے دیکھتی ہے کہ وہی بدمعاش کھڑا بچّے کو پھُسلا رہا ہے۔ غصّہ آگیا۔ اس کے پیچھے لپک ہی تو پڑی۔ لیکن ایک اور صرف ایک ہی گز بچّے سے آگے ہوئی تھی کہ وہ وہیں رُک گئی۔ بچّے کی طرف سہم کر گھما ہی رہی تھی کہ "دناں ناناں دن دن" اوہ، یہ کیا ہوا۔ کان کے پردے پھٹ گئے۔ دل دُھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ۔ دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اُچک پتھر پر، وہاں سے اُچک درخت پر، اور پھر اُچک اور اُوپر۔ بندریا بچّے کو چھوڑ درخت کی پھونگ پر تھی۔ باقی بندر جہاں کے تہاں تتر بتر بھاگ رہے تھے۔ زن سے ایک آدمی بڑے پتھر کی آڑ میں سے نکل بچّے کے پاس آیا۔ بچّہ زمین پر اوندھا پڑا کھیسیں نکالے کچ کچ، کچ کچ کر رہا تھا۔ بندریا درخت سے پتھر پر کودی۔ احمد نے دو فیر بارہ بور کے اور کئے دن دن۔ بندریا پتھر سے درخت پر اور درخت سے پتھر پر کُودنے لگی۔ دو جھاڑیوں نے کبھی ادھر لپکتے ہوئے اور کبھی ڈر کر بھاگتے ہوئے خو، خو، قوق، خو، خو کی پُر وحشت صدائیں نکالیں۔

بندروں کا پورا قبیلہ خو خو، قوق، خو خو چلّانے لگا۔ ادھر احمد نے جھک کر بچّے کو اُٹھایا۔ اُدھر سان سے پھسلتا ہوا زرد موٹر پتھر کے پاس آکر رُک گیا۔ ان سب واقعات میں ابھی دس سکنڈ بھی نہ لگے ہوں گے کہ احمد بچّہ دبائے موٹر میں کُودا۔ اور قریشی صاحب جو اب خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ اُسے لیکر سنسناتے ہوئے چل دیئے۔ اب بندر ہزار دوڑ دھوپ کریں کیا ہوتا ہے۔ بیسیوں موٹر کے تعاقب میں خو خیاتے دوڑے، لیکن وہاں کیا تھا سڑک خالی پڑی تھی۔ موٹر کا دُھواں تک نہ تھا۔ بندریا ان بوکھلائے

ہوئے بندروں میں ہر ایک کے آگے خوخو کرتی ہوئی، ناچتی ناچتی پھرنے لگی۔ ہر ایک بندر خود بھی کان پیچھے تانے، بھنویں چڑھائے گردن اور پیٹھ پر کے بال کھڑے کئے خوخو کر کے بندریا کو جواب دینے لگے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک اس سے کہہ رہا ہے "اے بُوا تم ہی نے کچھ کر لیا ہوتا"

بُوا نے بار بار ہر ایک کو خوخیا اور فی فیا کے بدن کو جھٹکے دیکر پیٹھ کے بال کھڑے کر کے بہادری پر آمادہ کرنا چاہا۔ مگر سب بے سُود رہا۔ اور جب کچھ اور ہوتا نظر نہ آیا تو خوخو، فی فی، خوخو کرتی ہوئی تیزی سے اُدھر دوڑی چلی گئی جدھر موٹر گیا تھا۔ کچھ نوجوانوں نے تھوڑی دُور اس کا ساتھ دیا۔ لیکن پھر وہ بھی لوٹ آئے۔

تپتے میدانوں اور گرد اُڑتی سڑکوں سے بھاگتی موٹر اور اُچکتے خوخیاتے بندروں سے پڑھنے والوں کا دماغ پریشان ہو گیا ہوگا۔ اس لئے ہم ایک پُرامن، پُرسکون، پُرعیش، پُرفضا، پُروضع، پُرتکلف مکان، کرسیوں، میزوں، کوچوں، صوفوں، دریوں، قالینوں، اوٹوں، پردوں، تصویروں آئینوں، گلدانوں، گملوں، پھولوں اور خوشبوؤں سے پُر پیش کرتے ہیں۔

قریشی صاحب کا مکان "فردوس کاٹج" ان عمارتوں میں سے نہیں ہے جو کہ شاہراہِ عام پر کھڑی اپنی شان و شوکت کی نمائش سر بازار کرتی ہیں بلکہ اُن چند ہستیوں کی طرح جن کو کہ دولت کی زیادتی خود آرائی اور خود ستائش سے بھی بالاتر کر دیتی ہے۔ یہ زبردست کوٹھی بھی کاٹج (چھپا) کا تخلص اختیار کئے شہر سے میلوں دور، سڑک سے ایک طرف چیڑھ کے درختوں میں چھپی کھڑی ہے۔ گویا کہ شہر اور سڑک سے اس کی ہستی کسی طرح زیر بارِ احسان نہیں۔ یہ خود اپنی تمام ضرورتیں آپ پوری کر سکتی ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے اس کے گیرج میں قریشی صاحب کی سیدھی سادی

بیوک اور بیگم صاحبہ کی رولز کے علاوہ دو بازاری فورڈیں آبے لونڈے جابے لونڈے کے احکام کی مُنتظر معمولی ضرورتوں کے واسطے نینی تال، کاٹھ گودام اور بریلی دوڑ بھاگنے کو تیار رہتی ہیں۔ کوٹھی کے احاطہ میں سیب، ناشپاتی، آلوچے اور خوبانیوں کے درخت پھلوں سے لدے، چکنے سمنٹ کے ٹینس کورٹ کے گرد کھڑے آرائش کی نازک خیالیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہر طرف گملوں، پودوں، جھاڑیوں، درختوں اور بیلوں میں پھول رنگ و بو میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ پس پُشت نہادہ ترکاریوں کا تختہ دُور اُفتادہ مؤدب شاگرد پیشہ سے اپنی مٹر پھلیاں اور ٹماٹر وغیرہ لٹکا لٹکا کر دل لگیاں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یا اپنی ہماں گرد و پیش کوٹھی نے اب یہی سادگی کا ایک جامہ پہن رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے میں کوٹھی بھی خوشنمائی کی کوشش کرتی نظر نہیں آتی۔ قیمتی لال ٹائل کی ہر طرف سے ڈھلواں چھت سے ڈھکا ہوا ایک ڈھیر سا ہے۔ جس کو قریب قریب ہر طرف سے شیشوں دار کھڑکیوں اور شیشے دار کٹہروں نے گھیر رکھا ہے اور اس میں سے ہفت پہل اور ہشت پہل شیشوں دار کھڑکیاں آگے کو نکلی ہوئی پھول دار بیلوں کے آنچل سر پر ڈالے جھانک رہی ہیں۔

چھوٹے سے پورچ نما برامدہ میں جس کو بیلوں اور لٹکے ہوئے گملوں نے فرن ہاؤس سا بنا رکھا ہے۔ دھوئے ہوئے سفید رنگ کی نازک خیال نازک طبع، نحیف الجثہ فردوس بانو بیٹھی نزاکت سے موٹی موٹی ڈکشنری اُٹھا کر السٹریٹڈ ویکلی کا معمہ حل کر رہی ہیں۔ ان کے سیدھے ہاتھ پر ٹیلیفون سے کچھ دُور نیچی تپائی پر ہلکا آسمانی جمپر سیتی ہوئی قریشی صاحب کی بیوہ بہن ٹیلیفون اور بھاوج دونوں سے خوفزدہ سی بیٹھی ہیں۔ برامدہ کے وسط میں خاموش سفید پوش ملازم بغیر پیروں کی آہٹ کے سامان لالا کر شام کی چائے کے واسطے میز سجا رہا ہے۔ برامدے کے دوسرے سرے پر

دو مائیں یا دو ساسیں گو ایک ہی کوچ پر بیٹھی ہیں۔ لیکن ہر طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

سفید رنگ، سادہ پوش، سفید بال، دُبلی پتلی، بے وجہ ہنسنے والی عقل سے خارج، ہر چیز پر قانع، ہر چیز سے خوش، یہ فردوس بانو کی ماں یا قریشی صاحب کی ساس ہیں۔ چاہیں تو خود مختار گھر کی مالک ہیں۔ لیکن نہ اپنے اختیارات سے واقف ہیں، نہ اختیار برتنے کی خواہش ہی ہے۔

دوسری موٹی بھدّی، زیورات سے آراستہ، رنگین کپڑے، ٹھگنا پلندہ کھچڑی سر، سُرمگیں آنکھیں، بھویں تنی، مُنہ ٹیڑھا۔ قریشی صاحب کی ماں اور اس لئے فردوس بانو کی ساس ہیں۔ خود مہمان طریق آئی ہیں۔ مالکانہ اختیارات ہر ہر لمحہ برتنے کے موقعے دیکھتی رہتی ہیں۔ احکامات جاری کرتی ہیں اور جب اکثر ان پر عملدرآمد نہیں ہوتے تو گھٹتی اور کڑھتی رہتی ہیں۔ ان کو ہر ایک سرکشی پر آمادہ اور اُن سے خلاف نظر آتا ہے۔ میاں کی زندگی میں سب راج راج چکی ہیں۔ اور گو وہ اور ان کے ساتھ دولت دونوں ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ لیکن طبیعت کی رعونت وہی باقی ہے۔ اس وقت بھی مدراسی آیا جو کہ ان کے پاس برامدے کے کنارے بچے کی جھلواں مسہری ہلا رہی ہے۔ بُری نظروں سے گھور رہی ہیں۔ کیونکہ اس کو حکم دیا تھا کہ سردی ہو رہی ہے، بچے کو باہر نہ لائے۔ اور وہ اپنے علمِ آیگی کو زور دیتی ہوئی بچے کو ہوا خوری کے واسطے باہر لے آئی ہے۔ اور برابر دُہرا رہی ہے "بابا لوگ کا کام ہم سے جادہ بی بی تم نئی جانتا۔ ہم کوئی نیا نئی ہے۔ ہم بڑا ایڑا ہیم لوگ پاس کام کیا ہے۔ بی بی تم نئی جانتا"۔

بی بی بھی ایکساں بڑبڑا رہی ہیں "اے چل! تیری صورت کو جھلسے۔ موئی چمر یہ چلی مجھ سے زبان درازی کرنے۔ بنی ہے بڑی میم کی بچی"۔ بیوہ لڑکی سے آخر نہ رہا گیا۔ اور جز بز ہو کر کہا "اماں چُپ بھی ہو جایئے

اور پھر بھاوج کی طرف مخاطب ہوئیں "اے دُلھن دیکھو تو ٹھیک ہے نا!"

فردوس بانو:۔ (ذرا اکھڑ کر) باجی دُلہن، دُلہن اچھا نہیں معلوم ہوتا آپکو کئی مرتبہ منع کیا۔ آخر آپ میرا نام کیوں نہیں لیتیں۔

کلثوم:۔ (یعنی نند۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر) ہو گا۔ منہ سے نکل گیا دیکھو تنگ تو نہیں ہو گیا۔

فردوس بانو نے جمپر لیکر دیکھا۔ نہ تعریف کی نہ منہ بنایا "ہاں ٹھیک ہے" کہتے ہوئے واپس کر دیا۔ اتنے میں موٹر آ گیا۔ قریشی صاحب نے اُترتے ہی احمد کے ہاتھ سے بندریا کا بچہ لے لیا اور اُسے لئے ہوئے بڑے زور سے آگے بڑھے "لیجئے بیگم" کہتے ہوئے بچے کو جو دونوں ہاتھوں سے کوٹ پکڑے بغل میں گھسا جاتا تھا کھینچکر آگے بڑھا دیا۔ بچہ دانت نکالے قیں قیں کرتا۔ دُھائی دینے لگا۔ بیگم صاحب اخبار پھینک ساری سنبھالتی ہوئی ہال کے دروازے کی طرف بڑھیں "بھئی ادھر ہی رہنے دو۔ اُدھر ہی رکھو" کہتی ہوئی بڑھیں۔ اندر چھپ جاتے اور باہر آجانے کے نہ طے ہونے والے فیصلے میں پڑکر وہیں رُک گئیں۔

بڑی بیگم یا قریشی صاحب کی والدہ بولیں "اچھا کیا میاں جو لے آئے۔ میں تو کئی دفعہ کہہ چکی تھی کہ بچے کے پاس بندر کی ہوا ہونے سے الا بلا بیماری پاس نہیں آتیں"

قریشی صاحب:۔ بی اماں آپ نے بھی کئی دفعہ کہا تھا اور احمد نے بھی مجھ سے کہا کہ بندر پاس رکھنے سے ہوا صاف رہتی ہے۔ دیکھئے آج میں لے ہی آیا۔

یہ کہتے ہوئے بندر کو پھر بیوی کی طرف بڑھایا۔ بیوی نے پھر کمرے میں گھس جانے کے آثار ظاہر کئے۔

"اُمی (یعنی قریشی صاحب کی ساس) بچے کے پاس لے جاؤ میاں دیکھو

کیا کرتا ہے "
آیا:۔ (جلدی سے بچّے کے سامنے آکر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر) اوہ نئی۔ نئی
بابا لوگ ڈر جائیگا۔ بابا لوگ کے کاٹ لیگا۔
بی اماں:۔ چل چڑیل۔ بڑی آئی۔ اماں بنتی ہے۔
فردوس بانو:۔ اے واہ بی اماں، اور کیا، ڈر تو جائے گا۔ (میاں سے) بھئی
ایسے نہیں، بس دُور ہی رکھو۔ دُور سے ہوا کیا نہیں لگے گی!"

فردوس بانو اور شاید قریشی صاحب ایک منٹ کے واسطے بھی بندر کی موجودگی بچّے کے پاس تو درکنار اپنے گھر میں بھی گوارا نہ کرتے لیکن شادی سے آٹھ برس بعد اللہ نے لڑکا دیا ہے۔ ہزاروں منّتوں مُرادوں کا بچّہ اور پھر وہ بھی نہایت کمزور دُبلا پتلا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سوکھے کی بیماری ساتھ ہی لئے پیدا ہوا ہے۔ ماں اور باپ دونوں اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں۔ گو ابھی ڈیڑھ مہینے کا ہے لیکن درجنوں، کوڑیوں طرح طرح کے کھلونے اس کے واسطے آگئے ہیں۔ ڈاکٹر ہر تیسرے روز اسے آکر دیکھتا ہے۔ کوئی کچھ بھی لڑکے کے فائدے کی بات بتا دے، ماں اور باپ دونوں روشن خیالی کو بالائے طاق رکھ کر جہالت اور توہم پرستی کے کام کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے بندر کا بچّہ انسانوں کے گھر میں آیا ہے۔ دیکھئے کس کروٹ اونٹ بیٹھتا ہے۔

تیسرا باب

بچّے نے آتے ہی ہوا صاف کرنے کی بجائے گندگی پھیلانا شروع کردی۔ دودھ جب دیا جائے پیالے میں ہاتھ ڈال دے اور انگلیوں میں سے ٹپکتی ہوئی بُوندیں چاٹنے کی کوشش کرے۔ سخت چیزیں کھا نہیں سکتا تھا۔ نرم چیزیں مثلاً گھُلے ہوئے کیلے اور کھچڑی اور کھیر کھائے تو کم اور چاروں طرف لیپے زیادہ۔ ہر ایک، اس کیلئے غذائیں، بیٹھنے کی جگہ اور مہذب بنانے

بنانے کے طریقے دُور ہی سے تجویز کرنے لگا۔ اور بیچاری نند کو اٹی آیہ گری اس طرح سپرد ہو گئی کہ گویا یہ اُن کا ہمیشہ کا ہی کام تھا۔ بیوہ نند نے جس طرح مُغلانی وغیرہ کے اور کام بھی بغیر عذر کئے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اپنے ذمے لے رکھے تھے یہ کام بھی لے لیا۔ اور کئی دن کی اُلٹ پلٹ کے بعد صاحبزادے کیلئے ایک بڑی سی دودھ کی بوتل میں نپل لگا کر ان کے دودھ پینے کا مسئلہ حل کیا۔ ایک چھوٹا سا کھٹولا بھی ان کے واسطے منگا دیا گیا تھا۔ جس پر کہ یہ دودھ پیتے وقت تو ضرور بوتل کے ساتھ لیٹ جاتے تھے۔ لیکن اس وقت کے علاوہ سوائے رفع حاجت کرنے کے بستر کو کسی اور مصرف کا نہ سمجھتے تھے۔ ہر وقت یہی کوشش رہتی تھی کہ کسی کرُسی پر چڑھ کر اس کے ڈنڈوں پر آرام کیا جائے۔ آخر کار سب نے ہار کر ان کو کمروں کے اندر سے نکال لڑکے کے کمرے سے ملے برامدے میں رکھنے کی جگہ منتخب کی۔ وہاں کٹہرے پر چڑھ کر اس کے ڈنڈے پر ان کو بھی آرام ملا۔ گو یہاں کالی کلوٹی مدراسی آیا آتے اور جاتے ان کے ٹیپیں لگاتی رہتی تھی۔ تاہم کھلی ہوا تو تھی سامنے کے درخت اور درختوں کے پیچھے پہاڑ تو نظر آتے تھے۔ یہ گھنٹوں بیٹھا بیٹھا اور کمر کھجا کر اس نظارہ کو دیکھا کرتا تھا۔

پہاڑ پر کے ان ہی درختوں میں سے ایک روز اس کی ماں نکلی درختوں سے کُود سٹارڑوں میں سے دبکی دبکی چل کر تین چھلانگوں میں کٹہرے پر آ، اسے سینے سے چمٹا لیا۔ بچھڑے مل گئے۔ ماں کے کلیجہ سے بچہ چمٹ گیا۔ زبانیں خاموش رہیں، دل سے دل مل گئے۔ نہ اس نے دنوں اور راتوں اُداس کرنے پہاڑوں پہاڑوں مارے مارے پھرنے کی داستان سُنائی نہ اس نے رو رو کر دودھ نہ پینے پر مار کھانے، کھٹولے پر نہ لیٹنے پر مار کھانے، کھیر لیسنے پر مار کھانے، کرتہ نہ پہننے پر مار کھانے، جگہ موتنے پر مار کھانے کے بیان کئے۔ بس ہوا تو اتنا ہی دھڑکتے ہوئے دو دل مل گئے۔ دودھ پیتے

ہوئے بچے کی اُوپر اور دودھ پلاتی ہوئی ماں کی آنکھیں نیچے۔ ایک دوسرے کی روحوں میں جذب ہونے لگیں۔ شام کی روشنی میں چھائے ہوئے ہلکے بادلوں کے سائے میں سوئے سبزے پر بجلی کا کوندا ہوا۔ بچہ چھاتی سے اور چمٹ گیا۔ ماں نے ہاتھ سے اور چمٹا لیا۔ شام ہو رہی تھی۔ موقع مخدوش تھا۔ بسیرے کا وقت آ گیا تھا۔ بندریا نے درختوں کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ جنگلے سے نیچے بھی نہ اتر سکی تھی کہ کی کی، کی کی کرتا ہوا بچہ سینے سے الگ کھنچ گیا۔ وہ پھر کٹہرے پر چڑھی بچے کو سینے میں دبایا اور پھر اُترنے لگی لیکن بچہ پھر کی کی چلّایا اور اس نے کمر پر بندھی رسّی ہاتھ سے پکڑ لی (آہ بچہ بندھا ہوا ہے) ماں پھر نیچے اُتری، رسّی نے بچے کو پھر کھینچ لیا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بجلی چمکی، بادل گرجا اور گرج پہاڑوں میں گونجنے لگی۔ شام شام، بسیرا، گھنے درخت سامنے تھے۔ سر پر بادل چھایا تھا۔ بندریا اور بچے دونوں نے رسّی کو کھینچا اور پھر کھینچا، برامدہ کے اندر اُترے، رسّی تانے تانے ایک چکّر کھایا اور کٹہرے پر چڑھ کر بچے کو چمٹا روانہ ہوئی۔ رسّی اب بھی موجود تھی، وہ تن گئی۔ یہ کلکلایا اور کھنچ گیا۔ بڑھتے اندھیرے میں، گڑگڑاتی بادلوں میں مامتا کی ماری دیوانی بندریا کھمبے کے گرد گھومی۔ کٹہرے کے جال میں سے نکلی اُوپر چڑھی، اُوپر سے کودی۔ کھمبے کے گرد گھومی، پھر کٹہرے کے جال میں سے نکلی۔ مگر آہ، رسّی سے نجات نہ ملی۔ بلکہ رسّی اور چاروں طرف سے اُلجھ کر تن گئی۔ اب ہلنا جلنا مشکل ہو گیا۔ بچے کی کمر کٹنے لگی اور وہ بُری طرح چلّانے لگا۔ بندریا کے دل پر وحشت تھی، دہشت تھی، خوف تھا، ہراس تھا، پریشانی تھی، حیرانی تھی، اضطراب تھا، یاس تھی، بےکسی تھی اور محبت کی آگ لگی تھی۔ اندھیرا چھا چکا تھا، بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ اسی حالت میں جھک سے ہو گیا۔ وحشت زدہ بندریا، دھنی، سے چلّا کر اچھل پڑی۔ کسی نے سوئچ لگا دیا۔ بجلی کے تین لیمپوں سے برامدہ دن کی طرح جگمگا گیا۔ ماں

کے ڈر کر زور سے اُچھلنے سے بچّے کی کمر میں رسّی نے بلا کا جھٹکا دیا۔ وہ کی کی خی خی چلا رہا تھا۔ اور کمرے کے دروازے میں مدراسی آیا "آئی ما آئی آئی۔ مونگ کی آئی آئی مونگ کی" چلا رہی تھی۔

بیوفا اقبال و ثروت کی پھر نہ ملنے والی تصوری مورتیوں کی پجارن، قریشی صاحب کی ماں، آیا پر بگڑتی، لڑکی کو جھڑکتی، بہو پر کلستی دوڑیں۔

دسترس سے باہر اقبال و ثروت کی خوشہ چیں۔ قریشی صاحب کی بہن آیا سے جھینپتی، ماں سے دبتی، بھاوج سے ڈرتی دوڑیں۔

سر چڑھے اقبال و ثروت کے نشے سے مخمور قریشی صاحب کی بیوی آیا کو گھرکتی، نند کا آنچل کھینچتی، ساس پر بگڑتی دوڑیں۔

اور اقبال و ثروت کی روشن خیالیوں سے نا آشنا۔ سیدھی سادی، قریشی صاحب کی ساس بھی ہنستی ہوئی ہر ایک سے راضی سب سے پیچھے آکر کھڑی ہو گئیں۔

بندریا بھبکیاں دیتی ہوئی برابر پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ملازم دوڑ آئے اور وہ آخری بھبکی دے کر اخروٹ کے درخت پر چھلانگ مار کر درختوں درختوں جنگل کو چل دی۔ اور رات کے اندھیرے میں جبکہ وہ ٹھنڈی ہوا اور بوندوں میں درخت پر دبکی بیٹھی تھی۔ یہاں فردوس کاٹج میں ریڈی ایٹر کی گرم شعاعوں میں اور شیڈ دار لیمپوں کی چھنی ہوئی روشنی میں کھانا ہونے لگا۔ میز کے گرد قریشی صاحب، ان کی بیوی، ساس، ماں اور بہن بیٹھ گئیں۔ ایک اسٹول پر آیا بچے کو گود میں لیکر بیٹھ گئی۔ دروازے کے پاس بند الماری کی کنڈی میں رسّی باندھ کر بندریا کے بچّے کو جگہ دی گئی اور ہنسی اور باتوں کے ساتھ ساتھ کھانا ہونے لگا۔ آیا بولتی تھی، صاحب ہنستے تھے۔ غرضکہ باتیں، مذاق، ہنسیاں، ہلکے ہلکے طعنے، جھڑکیاں، اعتراض اور پھر مذاق، پھر ہنسیاں بھی جاری تھیں۔ اور جب یہ جاری تھا تو بندر

کے بچے کا رسی کی حد میں جائیں، ہائیں، جائیں، ہائیں یکساں چکر لگانا بھی جاری تھا۔

بہت دیر کے بعد جبکہ کھانا ختم بھی ہو چکا تھا۔ ریڈیو بھی بول چکا تھا۔ جبکہ بندر کا بچہ خالی غسل خانہ میں بند کر دیا گیا تھا۔ جبکہ گھر والے اپنے اپنے کمروں میں اور ملازم اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں نیند سے بیہوش ہو چکے تھے۔ قریشی صاحب نے اپنے نرم گرم ریشم اور اون کے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے دُور دو آوازیں سُنیں۔ پہلے بندریا کی آواز تھی جس کو کہ زبردست ممتا نے بے قرار کر دیا تھا۔ وہ اُوں اُوں پکارتی درختوں پھر رہی تھی۔ اور دوسری، بہت دور، دو ہزار فیٹ نیچے بیر بھٹی کے قریب کسی نامعلوم شخص کی زوردار آواز تھی۔ جو کہ چلایا Now then my Lord اور پہاڑوں نے بتدریج گھٹتی ہوئی آوازوں میں جواب دیئے Now then my Lord — Now then my Lord۔

اندھیری رات ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور بارش کے خیال سے قریشی صاحب کے بدن میں جھُرجھُری آگئی۔ وہ گرم ریشمی لحاف میں دبکے اور سو گئے۔

دوسرے دن پھر بندریا کوٹھی میں دیکھی گئی۔ اور تیسرے اور چوتھے اور پانچویں دن پھر۔ کبھی بچے کے پاس، کبھی بچے کو دودھ پلاتے۔ لوگوں نے دیکھا۔ پتھر مارے، غل مچایا اور بھگا بھگا دیا۔ لیکن آخر میں یہی رائے قائم ہوئی کہ آتی ہے آنے دو بچے کو دودھ پلاتی ہے، اپنا کیا لیتی ہے۔ اس طرح بندریا دن میں کئی مرتبہ آکر بچے کو دودھ پلا جاتی تھی۔ اب اس کے واسطے یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ کیونکہ اس کی ٹولی پہلی ہی بارش پر ہر طرح اس کو ساتھ لے چلنے کی کوشش کرنے کے بعد اُسے اکیلا چھوڑ کر پہاڑوں سے

نیچے کوُچ کر گئی تھی ۔ اب اکیلی بندریا درختوں پر تنہا اچھل کود کر پھل پات سے پیٹ بھرتی اور دن میں دو ایک مرتبہ بچّے کو دودھ پلا جاتی تھی ۔ اسی دوران میں ایک دفعہ بچّے کے پاس روٹی کے ٹکڑے اور پھل پڑے ہوئے بندریا کو ملے ۔ جو کہ اس نے کھا لیئے ۔ پھر ایک دفعہ جب یہ دودھ پلا رہی تھی ایک عورت نے برابر کے دروازے میں سے آدھے دھڑ سے باہر نکل اس کی طرف روٹی کے ٹکڑے پھینکے ۔ پہلے تو یہ ڈر گئی ، بچّے کو چھوڑ ، جنگلے سے کود ، دو گز پرے کھڑے ہو کر ، کان پیچھے کو تان ، ہونٹ سکیڑ ، دہانے کو گول دائرہ بنا ، خوخو کی بھبکی دی ۔ مگر دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیکھا تو روٹی تھی ۔ پھر کٹہرے پر آ بیٹھی اور مزید احتیاط کے واسطے کان سکیڑ ، سر کو جھکا دے بھبکیوں پر بھبکیاں دیں ۔ جب دشمن کا احتمال نہ رہا ۔ دوستی کے ارادوں کا یقین ہو گیا تو نیچے کوُد روٹی کھانے لگی ۔ اس دن سے اکثر اس کو کھانے کی چیزیں ملنے لگیں ۔ دو چار دن بعد بارش نے پورا زور پکڑ لیا ۔ سخت سردی پڑنے لگی ، پہاڑوں پر کہر اچھا گیا ۔ بندریا کو کچھ تو غذا مل ہی جاتی تھی ۔ اب اس نے بھی کوٹھی کا دامن پکڑ لیا ۔ یہاں سردی اور پانی سے بچاؤ تھا ۔ باغ میں پھل ، کیاریوں میں ترکاریاں تھیں ۔ بچّہ پاس تھا ، ایک طرح پر یہیں رہنے لگی ۔ اور فطرت کا تقاضا ۔ پھل پھول ، ترکاریاں ، کھانے ، نوچنے اور برباد کرنے لگی ۔ اور جب اس طرح سے سیری ہو جائے تو گھر کا بھی جائزہ لے ۔ کبھی گلدان گرائے ، گملے لڑھکائے ، کبھی پردے نوچے اور ہال میں سے کُشن اٹھا لائے ۔ ان سب پر اضافہ یہ ہوا کہ بچّہ تو بندھا ہوا غلاظت کا چھڑکاؤ رسّی کے محدود دائرے ہی میں کیا کرتا تھا ۔ اور یہ آزادی کی وجہ سے نجاست کی تخم ریزی بنگلے بھر میں کرتی پھرتی تھی ۔ تو اصح شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد لوگوں کا دل ان سے بھر گیا اور اب طرح طرح سے انکو بھگا دینے کی کوششیں ہونے لگیں ۔ بی اماں آپا پر ، اور آپا بی اماں پر

بندریا کی دوستی کا الزام لگانے لگیں۔ فردوس بانو نند کو قصوروار ٹھہرا کر ان پر کلسنے لگیں۔ نند بیچاری کھسیانی ہنسی ہنس کر چھوٹے چھوٹے نئے نئے طریقوں سے خوشامد کرنے لگیں۔ فردوس بانو کی ماں ہر ایک کو حق بجانب ٹھہرانے اور ہر ایک کی طرف داری کرنے میں اور بھی زیادہ دیوانے پن کا ثبوت دینے لگیں۔ آخر کار جس دن ڈائننگ ٹیبل پر بندریا نے رفع حاجت کر کے واٹناٹ کے اوپر قطار میں رکھے ہوئے پورٹ وائن گلاسوں کی جگہ صاف کی تو چھن چھن، چھناچھن کی آوازیں بالکل پسند نہ آئیں۔ احمد کو نادر شاہی حکم دے دیا۔ اور احمد صاحب ریشمی قمیص، شلوار اور "ملّے" دار جوتہ پہنے، دو نالی بندوق اُٹھائے اُٹھائے، کوٹھی کے گرد پھر پھر کر چھت پر آنکھ مچولی کھیلتے بندریا کی گھات لگانے لگے۔ فردوس بانو کی سٹرن ماں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ٹھولنے اوّل ہر ایک سے باری باری بندریا کے حق میں سفارشیں کیں، اور جب سب طرف سے مایوسی ہو گئی تو روتی ہوئی داماد کے حضور میں حاضر ہو کر رحم اور جاں بخشی کی التجا کی "بیٹا بندریا کا مارنا بُرا ہے۔ ہمارے یہاں تو راس ہی نہیں آتا۔ مجھے تو وہم آتا ہے جنو فردوس ابھی اس کا بچہ چھوٹا ہے۔ بیٹا، بندر نہ مارو، اس کا مارنا بہت بُرا ہے"

نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بلائے گئے، ان کا بہادرانہ جوش ٹھنڈا کیا گیا۔ اور حکم دیدیا گیا کہ جان سے نہ مارا جائے، صرف ہوائی فیر کر کے ڈرا دیا جائے۔ اور بندوق شاگرد پیشہ ہی میں رکھی رہے۔ جب یہ آئے اسے ڈرا کر بھگا دیا جائے۔ بندریا کی بساط ہی کیا۔ بارہ بور کے دھڑاکوں سے اوسان خطا ہو گئے۔ دو ہی دن میں وحشت محبت پر حاوی ہو گئی۔ بندریا نے بنگلہ کا رُخ کرنا چھوڑ دیا۔

سخت سردی، سخت بارش، ٹھنڈی ہوا۔ کہرا، ٹپکتے ہوئے درخت بھیگی ہوئی گھاسیں، پہاڑوں کی کھوئیں اور کھڈّے۔ اور تنہا بندریا تھی۔

اس کی ٹولی اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ بچہ اس کا جیتے جی چھٹ گیا تھا۔ موسم ہر طرح اس کے خلاف تھا۔ غذائیں نئی تھیں اور کم تھیں۔ بندریا گھٹنوں کسی گیلے، اُگی ہوئی فرنوں کے سبز گدالے پر بھوکی بیٹھی، اپنے سے اوپر اور اپنے سے نیچے خاموش گھومتے ہوئے بادلوں کو دیکھا کرتی تھی یہاں تک کہ کہرا آ آ کر پھر سب قرب و جوار کو دھند میں غرق کر لیتا تھا۔ اور اس وقت بے بس بندریا جو نہ جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ دل پر چھائے غبار کو دھیمی، دبی او، او میں کھینچ کھینچ کے نکالتی تھی۔

یہ کیا ہوا کہ جدا ہو گئے گلے مل کے

ابھی تو زخم بھی بھرنے نہ پائے تھے دل کے

ادھر بندریا کے بچے کی یہ حالت کہ ماں سے مل کر چھٹنے کا صدمہ تھا۔ ہر وقت اس کے پھر آ جانے کا بے کلی سے انتظار تھا۔ اور جب اُمید ناامیدی سے تبدیل ہونے لگتی تھی تو وہ بھی اُو، اُو کرتا تھا۔ اور یہ اُو، اُو پُر یاس، دلخراش اُو اُو، دوپہر کے سناٹے میں، شام کی خاموشی میں، راتوں کی تاریکی میں ہر وقت بچے کے سینے سے نکلتی تھی۔ گندگی گو کم ہو گئی تھی۔ اور مالی نقصانات بھی اب نہ ہوتے تھے لیکن صبح اُو اُو، شام اُو اُو، پہر رات اُو، اُو، اِدھر پہر رات، اُدھر جب آنکھ کھلی تو اُو اُو، گھر کا گھر عاجز آ چکا تھا۔

ایک دن چند احباب اور لیڈیز کی ٹی پارٹی کے وقت اس آواز نے بندریا اور بچے کے متعلق باتیں چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ "بندر کے سینے میں قید کی حالت میں بہت جلد دق کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ بندر کو گھر میں کبھی نہیں رکھنا چاہیے"!

یہ سنتے ہی قریشی صاحب اور ان کی بیوی دونوں گھبرا گئے۔ اسی وقت انھوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ کل ہی اس بچے کو کہیں دور چھڑوا دیں گے، لیکن مہمانوں میں شیلا نام کی ایک نازک اندام، نوعمر، کم پڑھی اور زیادہ

روشن خیال، آریہ ورت تمدن اور نئی روشنی کے دو بُعد المشرقین سروں کو یکجا کر کے ایک ناممکن مرکب تیار کرنے کی کوشاں، بالکل ایسی لڑکی بھی موجود تھی۔ جیسے کہ اکثر نوجوان آجکل نظر آتے ہیں۔ اس لئے بندر کے بچے کو لینے کی التجا کی جو کہ فوراً قبول کر لی گئی۔ اور اس طرح حیوان کا بچہ فردوس کاٹیج کی ذلیل زندگی سے نکل کر اوک لاج میں خدائی کا درجہ حاصل کر کے رہنے لگا۔ کیونکہ گوبردھن لال دوبے، آئی سی ایس کی پریجال، نازک خیال، نازک بدن شیلا ہنومان مندر واقع تلی تال کے مست پجاریوں کی بیباک نگاہوں سے متنفر ہو کر جیتے جاگتے ہنومان کو پوجا کرنیکے واسطے ہی لے گئی تھی۔

خوبصورت، زبردست، عالی شان اوک لاج میں اعلیٰ انگلش مذاق کے مطابق نہایت قیمتی اشیاء سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، سائڈ روم اور پارلروں کے علاوہ ایسے بھی کمرے تھے جن میں انکھ سے گھڑی ہوئی رشیوں اور دیوتاؤں کی تصویریں لال رنگ سے دیواروں پر بنائی گئی تھیں۔ جہاں کی دیواریں اور فرش لپے پُتے اور صاف تھے۔ جہاں منجھی ہوئی پیتل کی جھلملاتی بالٹیوں اور کٹیوں میں پانی دُھلی ہوئی چوکیوں پر رکھا رہتا تھا۔ جہاں اشنان کئے، تلک لگائے، ننگے بدن، دھوتی اور جنیؤ پہنے گھر کے بُزرگ تپ اور جپ کرتے دھیان اور گیان میں لگے رہتے تھے۔ جہاں ستھری تھالیوں میں سیندور، صندل تلسی، ناریل وغیرہ پوجا کیلئے مہیا رہتے تھے۔ کمرے، جن کے برامدے کے اندر اور باہر مہین سفید دھوتیاں لمبائی میں پھیلی ہوا میں سرسراتی نظر آتی تھیں۔ جہاں دودھ پی لینے سے گندے ہو جانے والے گلاس، اور کھانا کھا لینے سے انتہائی ناپاک ہو جانے والے برتن استعمال کے بعد لُڑھکا دئیے جاتے تھے، جہاں کتا اُن کو اُس وقت تک چاٹتا تھا جب تک کہ بہت

سے جمع ہو جانے کے بعد ایک دفعہ پھر کہار آ کر اُن کو مٹی گوبر سے صاف نہ کرے۔ اسی برامدہ سے ملی ایک کوٹھڑی میں، دیوار سے ملی ایک کیل گاڑی گئی۔ زمین گوبر سے لیپی گئی۔ تعلیم یافتہ، روشن خیال، فیشن کی دلدادہ، دھرم کی پکّی، جدّت پسند، ترقی کی حامی، لیڈر منش، ہنومان بھگت، سُندر دیوی شیلا اشنان کئے، تر بال بکھیرے، اُٹھتی جوانی کو کیلی ریشمی ساری میں لپیٹے۔ ایک ہاتھ میں لُٹیا لٹکائے دوسرے ہاتھ کی ہتیلی پر پوجا کے سامان سے بھری تھالی رکھے ہنومان جی کی پوجا کو آئی۔ بندر کا بچہ پیتل کی ایک طشتری، جس میں اس کو کھانے کو کچھ دیا گیا تھا دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھے زور کر رہا تھا۔ فوراً شیلا دیوی کی طرف متوجہ ہوا چھن چھنا نانا، سر سے تھالی گری، لُڑھکی اور چھنچھنائی۔ بندر ہمہ تن گوش شیلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہاتھ کے بجائے پیر سے تھالی کو پکڑ ہلانے جُلانے لگا۔ شیلا عقیدت سے پُر مطمئن، مؤدب سامنے بیٹھی پوجا میں مصروف ہو گئی لیکن بندر کو قبل از وقت ہی چڑھاوے کی چیزوں کی فکر ہوئی۔ اس نے رسی کی حد تک بڑھکر ہاتھ بڑھایا۔ تھالی گو دور تھی۔ شیلا نے اینچ بھر اور دور کھسکا لی۔ بندر نے کھونٹے کے مرکز پر دو نصف دائروں میں چکر کی چہل قدمیاں کیں، اور تیسری ٹہل میں جھٹ کھونٹی کی طرف سر کر، دھڑ بڑھا، پچھلا پیر لمبا کر تھالی پیر سے پکڑ لی۔ لیکن فوراً ہی ادھر شیلا نے اپنی طرف تھالی پکڑلی۔ زور ہونے لگے۔ شیلا کے بھولے چہرے پر حیرت، غصہ اور پریشانی کے آثار آ گئے۔ گالوں پر سُرخی، مُنہ پر گھبراہٹ، ساری سینے سے ہٹ گئی۔ "اچھا لے!" کہہ کر تھالی بندر کی طرف دھکیل سیدھی کھڑی ہو گئی۔ غصہ بھری نگاہوں سے بندر کو جو کہ ناریل، سیندور اور پھولوں میں مصروف تھا تھوڑی دیر گھورتی رہی۔ اور پھر ناگن کی طرح بل کھاتی، بجلی سی کوندتی، تیزی سے کئی کمرے پار کر کے اپنے پُر تکلف آراستہ کمرے میں پہونچکر

اس کے دروازے بند کر کے ایک کونے میں لٹکے ہوئے لنکا کے جزیرے کو ہتھیلی پر اُڑتے ہوئے ہنومان کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ اور آنکھیں بند کر کے بصد عجز و انکسار اپنے ملنے والی پتی پروفیسر دیا شنکر دوبے (جن کے ساتھ پھیرے بچپن ہی میں پھر چکے تھے لیکن اُن سے وہ ابھی تک نہیں ملی تھی) کے حق میں دُعائیں مانگنے لگی۔

چونکہ طرح طرح کے لوگ اُمیدوں میں پھلنے، منصوبے گانٹھتے طرح طرح سے دُنیا کے بکھیڑوں میں اُلجھے۔ اصل خدا اور اصل خدا کے اٹل منصوبوں سے بے خبر طرح طرح کے خداؤں کی پوجا میں مصروف رہتے ہیں، اس لئے فردوس کالج کے باشندے بھی پرستش میں مصروف تھے۔ اور یہ اتفاق تھا کہ ٹھیک اس وقت جبکہ شیلا ہنومان جی کے گیان میں تھی۔ یہ لوگ بھی ٹھیک اسی وقت فردوس کالج سے ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ نیچے بیر بھٹی کی آبادی میں عجب شاہ کے مزار پر سرِ عقیدت خم کئے مُرادیں مانگنے، اور منتیں ماننے میں مصروف تھے۔ قریشی صاحب مزار کی چھوٹی سی چار دیواری کے باہر اپنی موٹر کی پچھلی سیٹ پر سگار مُنہ میں دبائے آدھے لیٹے اور آدھے بیٹھے، تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھولے، ہلکے ہلکے سگار کا دھواں اُڑانے میں مشغول تھے۔ لیکن ان کی چہیتی پر جمال بیوی، جگر پارے، دل کے ٹکڑے کمزور لڑکے کی تندرستی اور صحت کی دُعا، ہاتھ اُٹھا، آنسو ڈبڈبائے دو زانو قبر کے پائینتانے بیٹھی مانگ رہی تھیں۔ ان کے ایک طرف مٹھائی سے بھری دو سینیاں ریشمی رومال سے ڈھکی، مٹی کی رکابی میں مُسلگتے ہوئے لوبان سے روحانیت حاصل کر رہی تھیں۔ اُن کے دوسری طرف قبر کے برابر زمین پر پڑا بچہ ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ان سے پیچھے بچے کی طرف احمد بیٹھے بیکار کی چٹکیاں بجا رہے تھے۔ اور لوبان کی طرف فردوس بانو کی ماں

بیٹھی لوبان کا متبرک دھواں دونوں ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ کر منہ پر ملنے کی ناممکن کوشش کر رہی تھیں۔ قبر کے سرہانے کی طرف جہاں چھوٹے سے محراب وار دھوئیں سے کالے طاق میں مٹی کا دیا شام کے انتظار میں منہ فق بیٹھا تھا۔ بی اماں کا ڈھیر ہاتھ اٹھائے، آنکھیں میچکائے من ہی من میں کہہ رہا تھا "شاہ صاحب لڑکے کے دل سے اس جورو کی محبت کم کیجئے اور میری محبت اور عزت اس کے دل میں بڑھائیے"

دروازے کے برابر لیکن چار دیواری کے اندر نند کھڑی تھیں اور انکی گود میں بھاوج کا فرکاکوٹ، بچے کی رضائی، اماں کا دوشالا تھا۔ یہ انہی کو کلیجے سے چمٹائے آنکھیں بند کئے کھڑی تھیں۔ گویا برسوں کے بعد یہ پیارے ملے ہیں۔ سینے سے چمٹائے محبت کی سینک لے رہی ہیں مگر نہیں صاحب یہ بھی دل میں کہہ رہی ہیں "شاہ صاحب بھابی کے دل میں کچھ ایسا ڈالئے کہ میرا مہینہ کر دیں اور میں سب بکھیڑوں سے الگ اپنے ہی گھر میں بدایوں میں رہوں" دروازے کے برابر لیکن چار دیواری سے باہر مدراسی آیا، کافر سیاہ، جس کو اندر آنا منع تھا کھڑی ہوئی ہر ایک کو باری باری سیاہ چہرے میں سفید دانت دکھا رہی تھی۔ اور چونکہ ہر ایک اپنی طرف مصروف تھا لہذا موقع کے منتظر متولی، مجاور یا سجادہ نشین جو بھی سمجھو، ولی کامل شاہ ولی اللہ صاحب بھی حجرے کے دروازے کی باہر دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے تسبیح میں مصروف تھے۔ آپ کا نورانی گندمی چہرہ تیل میں چمکتا، اوپر کی طرف گنبد نما جالدار ٹوپی، نیچے کی طرف سیاہ چوکھنٹی ڈاڑھی سے اور دائیں بائیں، دونوں طرف بل پر بل کھائے گیسوں پھکنیوں میں وابستہ روحانیت کے تمام مدارج طے کر کے حضور خداوندی میں مصروف معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جیسے ہی فردوس بانو نے دعا ختم کر کے آزوباز و دیکھا آپ ہوشیار ہو گئے۔ فوراً تسبیح ہاتھ میں لپیٹتے ہوئے اٹھے

کونے میں رکھے ہوئے کائی زدہ گھڑے میں زنجیر سے بندھا ٹین کا ٹاملوٹ ڈال کر پانی نکالا۔ جلدی سے تین کلیاں کر مٹھائی کی سینیوں کے پاس دوزانو آ بیٹھے۔ مزید لوبان سے مزید دھواں اُڑایا گیا۔ چراغی کے پانچ آنے اور لوبان کے پانچ آنے، نذرانہ کا سوا روپیہ لیکر نذرانہ، فاتحہ ہوا۔ چادر چڑھائی گئی۔ منت کا ناڑا باندھا گیا۔ اور چلتے چلاتے ایک مرتبہ پھر دعا کیلئے ہاتھ اُٹھ گئے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے کنپٹی پر سے رخسار مبارک پر آ کر ٹہلنے والی گستاخ جوں کو چٹکی سے مسل کر حجرے کی طرف پھر رُخ کیا۔ وہاں سے قلم دوات اور کاغذ لا کر پھر بیٹھ گئے۔ کاغذ گھٹنے پر رکھ دُعاؤں پر دُعائیں پڑھتے ہوئے تعویذ لکھنا شروع کر دیا۔ کئی روز سے مینہ برابر پڑ رہا تھا۔ دوپہر سے رُکا تھا۔ لیکن اب بوندیں پھر پڑنا شروع ہو گئیں۔ باہر کھڑی مدراسن نے شور مچایا "آئی، آئی، ہیم شاب پانی گرتی"۔ جلدی جلدی سب لوگ موٹروں میں سوار ہوئے۔ شاہ صاحب نے آخری مرتبہ دُعا پڑھ کر موٹر میں جھک کر لڑکے پر پھونک ڈالی۔ قریشی صاحب نے اپنا موٹر بڑھایا۔ پھر احمد نے۔ بیربھٹی کے چھوٹے سے بازار میں سے جب موٹر نکل رہے تھے تو ایک بیل گاڑی کے سدِ راہ ہو جانے سے دونوں موٹر کچھ دیر رُکے۔ وہاں کے ایک مکان کے اوپر سب نے پروفیسر دیا شنکر کو کرسی سے بندھے ہوئے بیٹھے دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے Now then my Lord تو یہی وجہ ہے کہ آپ دیش کے انشکاروں، منشی شتوں کے اونچے وکاس کے جیوستار ہوتے ہیں۔ اور ہم چنتا شیتا نئی نکتا کلا دو دیا آدمی کے پاپوں سے سماوچک ہو کر شدھ سو باش ہوتے ہیں۔ آج بھارت کے دمی ادھ سماوچک کے گن گانے کو مان سیک وشون میں پراکٹ کرنے کو موٹر جا رہے ہیں۔ اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب نے جھک کر موٹروں کو غور سے دیکھا اور پھر "Now then my Lord" کہہ کر کچھ اور

کہنے لگے۔ لیکن بیل گاڑی ہٹ جانے سے گاڑی پھر چل دی۔ ان لوگوں کو اس پاگل کی باتوں پر سخت حیرت تھی۔ لیکن ان لوگوں کا کیا معلوم کہ ان کی غیر موجودگی میں فردوس کاٹج میں ایک اور پاگل اس سے کہیں زیادہ پاگل پنے کی باتیں کر رہا تھا۔ یہ نوجوان قریشی صاحب کا حقیقی بھتیجا عبدالحکیم تھا۔ جو کہ احمد کی کوٹھری میں اپنا پھیلا ہوا شیو کا سامان، مسکی ہوئی ٹائیاں، ملگجے سوٹ، گھسے ہوئے موزے وغیرہ سمیٹ کر سامان باندھنے میں مشغول یہ شعر بھی پڑھتا جاتا تھا اور مقدر کو سنے اور قادرِ مطلق کو گالیاں بھی دیتا جاتا تھا ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کے کیا کیا تقاضے ہیں
متاعِ بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہزن پر

ارے واہ چچا غالب خوب کہا ہے۔ مگر یار مقدّر کی جوتے کاری تمہاری کھوپڑی پر بھی پوری طرح ہوئی ہے۔ ورنہ ہرگز یہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیا کہا ہے ع

متاعِ بُردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہزن پر

بھئی واہ کیا کہا ہے۔ بُڑھوؑ کو رہزن بنا دیا۔ ارے رہزن نہ سہی تو نہ سہی لیکن یار ــ ایسے قسامِ ازل کو الرحمٰن الرحیم کا لقب اختیار کرنا کہاں تک صحیح ہے۔ ارے بھئی قسامِ ازل آنکھیں بند کر کے جس کو چاہا جتنا دیدیا۔ سب تمہارے آگے بے بس ہیں۔ مگر بڑے میاں الرحمٰن الرحیم بنتے تو تم کو شرم آنا چاہیئے۔ کیا اسی کا نام رحم اور انصاف ہے آج میں اسی کوٹھی میں راج کرتا ہوتا۔ یہ کوٹھی میری ہونی چاہیئے تھی۔ بریلی اور بدایوں کے گاؤں، بمبئی کی بلڈنگیں، بینکوں میں کا روپیہ سب میرا ہونا چاہیئے تھا۔ بڑے بیٹے کا لڑکا میں ہوں مگر واہ آج پچھتر روپیہ چھ آنہ کی ملازمت پر ہوں، اور اس شسری نوکری کے بھی

لالے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا ہرج تھا اگر والد صاحب کچھ دن اور زندہ رہ جاتے۔ کچھ ہی دن اور۔ صرف ڈیڑھ برس اور زندہ رہ جاتے نہ اچھا اللہ میاں اگر آپ کو ان کے بلا لینے کی اتنی ہی سخت ضرورت تھی تو بڈھے دادا کو ہی پہلے بلا لیا ہوتا۔ ارے زیادہ نہیں دس پانچ ہی دن پہلے دادا صاحب لڑھک گئے ہوتے۔ تو میں تو مجبور نہ ہوتا۔ کیا بے انصافی ہے۔ کیا بے انصافی کے قانون ہیں۔ آج میں مجبور ہو کر جھیتھڑے لگائے پھرتا ہوں اور چچا صاحب نواب بے مزے اڑاتے ہیں۔ ذرا سی سفارش کیلئے آٹھ دن سے شاگرد پیشہ میں پڑا ہوں۔ جس دن یہاں آیا تھا تو خیر واقعی برج کے کھلاڑی مہمان ٹھیرے ہوئے تھے۔ چلو احمد کی ہی کوٹھڑی میں ٹھیر گیا۔ لو وہ بھی چلے گئے۔ اور کسی نے منہ سے یہ نہ پھوٹا کہ اب کوٹھی کے کمروں میں سے کسی میں آجاؤ۔ ذرا سی سفارش کو کہا تو ڈرتے ہیں کہ میری بات جائے گی۔ ہاں بھئی تمہاری بات نہ جائے۔ چاہے میں فاقے کروں۔ لعنت ہے ایسے چچا پر اور لعنت ہے مجھ پر بھی جو میں ان کے پاس آیا۔ لو دیکھو آج کا وعدہ تھا کہ کرافورڈ صاحب سے میرے لئے ملیں گے۔ تو چل دیئے۔ کہاں؟ مزار کی پوجا کرنے۔ ارے جب اُن بڑھو کی ہی پوجا سے کچھ نہیں ہوتا تو مٹی کے ڈھیروں کی پوجا سے کیا ہوگا!!

اسی طرح بکتے ہوئے سامان باندھ، مالی کے کندھے پر رکھ، سڑک پر جا، تیز بارش میں بھیگتے ہوئے نیچے جاتی ایک لاری میں بیٹھ حکیم روانہ ہو گیا۔ راستہ میں یہ شعر بھی وردِ زبان تھا ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کے کیا کیا تقاضے ہیں
متاعِ بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہزن پر

چوتھا باب

انشاء اللہ خاں انشاؔ تو مخول لئے ہیں۔ ان کا کہنا ع

نلچے ہے پڑی عالمِ لاہوت میں ننگی

محض بیہودہ گوئی خالص ہزل ہے۔ لیکن دراصل عالمِ لاہوت کا نقشہ یہ ہے، ستّر ہزار برس پورب، ستّر ہزار برس پچھم، ستّر ہزار برس اُتر اور ستّر ہزار برس دکھن، ستّر ہزار برس اُوپر اور ستّر ہزار برس نیچے اگر خیال دوڑے تو اس عالم میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خلا ہی خلا ہے۔ کہیں کچھ نہیں ہے اور اس انتہائی تنہائی اور نابودیت کے وسط میں اگر ہے تو صرف ایک چھوٹی سی ٹائم پیس ہے۔ جو عالمِ لاہوت میں ٹِک، ٹِک، ٹِک کر رہی ہے۔ صدیاں اور قرنیں گزر گئی ہیں۔ عالمِ لاہوت کی گھڑی ٹِک ٹِک، ٹِک کر رہی ہے۔

صدیاں اور قرنیں گذر جائیں گی اور عالمِ لاہوت کی گھڑی ٹِک ٹِک کرتی رہے گی۔

جب سیّارے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں، جب دُنیائیں پاش پاش ہو جاتی ہیں تو عالمِ لاہوت کی گھڑی تنہا اس وقت بھی ٹِک، ٹِک، ٹِک کرتی ہوتی ہے۔

جب چڑیا کا انڈا گھونسلے میں سے گر کر بھج سے ہو جاتا ہے اور چڑیا چیں چیں، چیں چیں کرتی پھڑپھڑاتی ہے تو عالمِ لاہوت کی ذاتِ واحد گھڑی، اس وقت بھی ٹِک، ٹِک، ٹِک کرتی ہوتی ہے۔

مست شرابی کی بے سُری تانوں سے، بھوکے یتیم کی ٹھنڈی سانسوں سے، بیوہ کی سِسکیوں سے، حسن پرست نوجوانوں کے قہقہوں سے بیخبر عالمِ لاہوت میں گھڑی ٹِک ٹِک کرتی ہے۔

ذاتِ باری کے مذاق اُڑائے جاتے ہیں۔ اس پر گالیاں پڑتی ہیں حتیٰ کہ جانوروں، پتھروں، مٹی کے ڈھیروں میں خدائی اوصاف لگا کر ذاتِ مطلق کو چڑایا جاتا ہے۔ عالمِ لاہوت کی گھڑی پھر بھی ٹِک، ٹِک، ٹِک ہی کرتی رہتی ہے۔

کیا شانِ بے نیازی ہے ٹِک، ٹِک، ٹِک۔
شیلا سُن، فردوس بانو سُن، سُن اے عبدالحکیم سُن :۔
ٹِک، ٹِک، ٹِک۔

پہاڑوں پر کی بارش میں، بلا کی ٹھنڈی تیز ہواؤں میں، بھیگی ہوئی بندریا اندھیری رات میں، اندھیرے جنگل کے ایک بھیگے ہوئے ٹپکتے درخت پر بیٹھی ہے۔ برساتی پہاڑی نالہ پاس ہی کہیں اندھیرے میں گڑگڑاتا، دھڑدھڑاتا، جھرجھراتا بہہ رہا ہے۔ آزو بازو پہاڑ کی سیاہ ڈھالیں اُس کی آواز سے گونج رہی ہیں۔ اور نالہ کی ان مبہم آوازوں میں سے بچ کر نکلتی ہوئی کبھی کبھی بندریا کی دبی ہوئی لمبی آواز سُنائی دیتی ہے۔ اندھیرا ہے، بارش ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں۔ نالہ دھڑدھڑا رہا ہے، نالیاں جھرجھرا رہی ہیں۔ اس میں بیکسی کی اُو۔ اُو ہے۔ اور پھر اُو۔ اُو ہے۔ لیکن اب کی لمبی دردآمیز اُو۔ اُو کے بعد خی خی خی خی۔ یہ کیسی؟ کیا کوئی اُسے چھیڑ رہا ہے۔ کیا کوئی اندھیرے میں اس کے برچھیاں چبھو رہا ہے۔ "اُو اُو۔ خی خی خی خی" کیا بات ہے؟ ضرور کسی تکلیف میں ہے۔ رہ رہ کر اس کے درد سا ہوتا ہے۔ یا کوئی سخت بے چینی ہوتی ہے۔

کچھ جانور اور اس اندھیرے میں حرکت کرتے معلوم ہوتے ہیں وہ چار گلہریاں درختوں سے اتر کر گھانسوں اور پودوں میں گھاسائی مغربی چڑھائی کی طرف جا رہی ہیں۔ اس طرف چند سیتیاں اور خرگوش بھی

جا رہے ہیں۔ بسیرا چھوڑ چھوڑ کر چند پرندے بھی گرتے پڑتے پھڑپھڑاتے ادھر ہی کو اُڑ رہے ہیں۔ بندریا ابھی تک وہیں بیٹھی درد آمیز اُو، اُو، اُو اور پھر گھبرائی ہوئی خی خی خی کر رہی تھی۔ لیکن اب وہ بھی ڈالی ڈالی کر کے درخت سے نیچے آ گئی۔ مگر یہ بالکل دوسری طرف اسی طرح آوازیں نکالتی چل دی۔ کدھر جا رہی ہے؟ فردوس کا بچہ؟ ہاں ہاں وہیں۔ اندھیرے میں چھپتی چھپاتی برابر اسی طرف چلتی رہی۔ ایک جنگلی بلی بھی اس کو سامنے سے آتی اور دوسری طرف جاتی نظر آئی۔ مگر یہ نہ رُکی اور آخر سوتے ہوئے فردوس کاٹیج کے پاس پہونچ گئی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ لیمپ بھی قریب قریب سب گُل کر دیئے گئے تھے۔ کمروں کے اندر دو تین مدھم روشنیاں معلوم ہوتی تھیں۔ بندریا نے اسی برامدے میں آ کر اُو۔ اُو کرنی شروع کر دی۔ مگر جب جواب نہ ملا تو خی خی خی کر کے اِدھر اُدھر دوڑی۔ کھڑکیوں کی شیشوں کے پاس اُو۔ اُو کی۔ بند دروازوں کے پاس اُو اُو کی۔ مگر کہیں جواب نہ ملا۔ آہ بچہ کہاں ہے؟ جلدی اور گھبراہٹ میں خی خی خی کرتی دوڑتی پھری۔ چھت پر چڑھی، نیچے کُودی، کوٹھی کے دوسری طرف بھاگ گئی۔ اِدھر اُو۔ اُو اُدھر اُو۔ اُو کی۔ اور جب کمروں میں جانے کا راستہ نہ ملا تو پھر کوٹھی کا چکر لگایا۔ گھبرائی پریشان بندریا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر دوڑی پھر رہی تھی۔ کہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی نظر آ گئی۔ کُود اس میں، وہاں سے کمرے میں کرسی پر کودی، میز پر چھلانگی، آتشدان پر اُچھلی۔ گلدان گرا دھڑ سے۔ اُو اُو کرتی بندریا نے ایک دروازہ اور دیکھا۔ یہ اس میں سے ہو کر دوسرے کمرے میں دوڑی۔ وہاں بھی گھبرائی بوکھلائی پھری۔ اور اس میں سے تیسرے کمرے میں ٹھیک اس وقت پہونچی جبکہ گھر کے اندر فردوس بانو کی گھگی کی آواز بھی گھر کے باہر کے تمام پہاڑوں پر پھیلی ہوئی بھاری مدھم، خوفناک گڑگڑاہٹ میں مخلوط ہونے لگی تھی۔

یہ خوفناک آواز ہزاروں فٹ نیچے سے پیدا ہو کر بتدریج بڑھتی اور میلوں میں پھیلتی جارہی تھی۔ اب کمرے اس آواز سے گونج رہے تھے، دیواریں تھرا رہی تھیں۔ بندریا کی آواز سے جاگی ہوئی فردوس بانو اور فردوس بانو کی آواز سے جاگے ہوئے اور لوگ، سب اس آواز سے خوفزدہ اوسان خطا اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے۔ محبت اور خالص محبت کی ماری بندریا بچے کی تلاش میں سرگرداں پہونچی، اور قریشی صاحب کے اکلوتے لڑکے کی مسہری پر پہونچی۔ محبت، محبت اور خالص محبت! جسمیں انتقام، حسد، رشک اور نفرت کبھی شامل نہ ہو سکتے تھے۔ دل کیلئے پھائے کی طالب تھی، سینے سے چمٹانے کیلئے بچے کی ضرورت تھی۔ بچہ مل گیا۔ کیسا؟ اور کون اور کس کا۔ اس سے کیا مطلب۔ کپڑوں کو نوچا، رضائی کو کھینچا۔ اور جلدی سے آدم کے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ مدراسن بُری طرح چلائی۔ بندریا نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور وہیں سے جست کی۔ اِدھر دوڑی۔ اُدھر اچکی۔ کچھ لوگ اُٹھ بیٹھے تھے، کچھ چلا رہے تھے، کچھ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ دروازے اور بھی کھل گئے تھے۔ ہڑاہڑ، ہڑاہڑ۔ ہاؤں، ہاؤں سے دل کانپ رہے تھے، دیواریں کانپ رہی تھیں۔ مکان اور درخت ہی نہیں بلکہ پہاڑ بھی کانپ رہے تھے۔

اُس وقت بندریا گھر سے باہر بچے کو لئے ہوئے نکلی۔ اب کیا ہو سکتا تھا، پہاڑ گر رہا تھا، لینڈ سلپ ہو رہی تھی۔ پوری زمین، مکان، باغ، درخت اوپر نیچے کے جنگلوں سمیت تیزی سے نیچے پھسل رہی تھی۔ سکنڈوں نہیں بلکہ پلکوں حالت بدل رہی تھی۔ زمین جگہ جگہ پھٹی۔ سیدھے درخت اپنی اپنی جگہ ٹیڑھے بکھرے ہوئے تھے۔ قریشی صاحب کی کوٹھی کانپی لرزی، پھوٹ پھوٹ ہو کر بزدل کی طرح اڑا اڑا کر بیٹھ گئی۔ دھڑ دھڑ۔ ہاؤں۔ ہاؤں کی بڑھتی ہوئی تا بفلک آوازوں میں گری ہوئی کوٹھی کا ملبہ نیچے

دوڑا۔ پیچھے سے گرتے پڑتے سرنگوں درخت دوڑے، ہزاروں من کے پتھر، لاکھوں من کی سلیں دوڑیں۔ یہ سب آپس میں مخلوط ہوئے اور نیچے کو دوڑے۔ ہزاروں قدآور درخت، کروڑوں من ملبہ، لاکھوں من پتھر ایک دوسرے پر گرتے۔ پلٹے کھاتے، ٹوٹتے، توڑتے انہدام ہوتے، خود تباہ ہوتے اور سامنے کی ہر چیز کو تباہ کرتے گر رہے ہیں اور گرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان ہی میں، ان آوازوں میں، اس اندھیرے میں، لاکھوں لڑھکتے ہوئے پتھروں میں، تیز پھسلتی ہوئی سلوں میں، مشتِ خاک تین ٹانگ کی بندریا ہے۔ (کیونکہ ایک ہاتھ سے بندریا کو تھامے ہے) چھوٹے پتھروں سے کتراتی ہے۔ بڑے پتھروں پر چڑھ جاتی ہے۔ سلیں اور چٹانیں اس کو پیس دینے کیلئے پھسلتی ہوئی لپکتی ہیں۔ یہ کود ان ہی پر سوار ہو جاتی ہے۔ دیوہیکل درخت سیکڑوں ہاتھ پھیلائے اس پر لڑھکتا ہے۔ جھاڑو سا دیتا سامنے کی ہر چیز سمیٹتا آتا ہے۔ بندریا اس کی ڈالی اُچکتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں من سلیں، پتھر، درخت، مٹی برابر اوپر سے گر رہی ہیں۔ پہاڑ کا اس طرف کا پورا ڈھال چوٹی سے لیکر نیچے بیر بھٹی تک پھسل پڑا ہے۔ بیر بھٹی کی آبادی کئی سو فٹ ملبہ کے نیچے دفن ہو گئی ہے۔ کیا جھونپڑا، کیا مکان کیا امیر، کیا غریب، کیا پیر، کیا فقیر سب دفن ہو چکے ہیں۔ فردوس کالج کی منتشر ٹکڑوں پر بھی گزوں بلکہ بلیوں ملبہ گر چکا ہے۔ اور گر رہا ہے۔ اور اب بھی اس شورِ قیامت میں، اس اندھیرے میں، بندریا پتھر سے چٹان پر اور چٹان سے درخت پر، درخت سے نگل جانے والے ملبہ پر اُچکتی ہے۔ تین ہی ہاتھ پیر ہیں۔ ایک ہاتھ سے بچہ سینے سے چمٹا رکھا ہے۔ بندریا ہر وقت اُچھل رہی ہے۔ ہر کچل کر پیس لینے جانے والی چیز پر اُچک کر سوار ہو جاتی ہے۔ اور پھر جب اس چیز کے خود دفن ہونے کی نوبت آتی ہے تو اس سے اوپر آنے والی چیز پر اُچک کر سوار ہو جاتی ہے۔ اندھیرے میں گرد اُس

اس قدر ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ آوازیں ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ قیامت برپا ہے.....

رات کی تباہ کاریوں کے بعد فلکِ پیر انتہائی معصومیت سے مُسکرایا۔ خاموش پہاڑوں میں صبح ہوئی۔ بادل بھی پھٹ چکے ہیں۔ کہرا ابھی نہیں ہے ہوا بھی بند ہے۔ دو چار چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ بیر بھٹی کی آبادی تین سو فٹ ملبہ اوڑھے ٹھنڈی پڑی سو رہی ہے۔ سامنے محمور کا لا پہاڑ ڈیڑھ میل چوڑا، دو ہزار فٹ لمبا کتھئی بھورا دہانہ پھاڑے جمائی سی لے رہا ہے۔ لمبی چوڑی جمائی ہے کچھ عرصہ لگے گا۔ پانچ چھ سو برس میں پھر اس دہانے کو گھنے جنگل اُگ کر ڈھانک لیں گے۔ ابھی تو یہی خالی جگہ ہے جہاں زمین اُوڑھے بیر بھٹی دبی پڑی ہے۔ اور یہ بے ترتیب ڈھیر بھی یا تو جب تک بہہ بہا کر خلیج بنگال کی تہ میں ہو گا یا اس پر بھی گھنے جنگل اُگ کر اسے سرسبز میرگاہ بنا دیں گے۔ لوگ جنھوں نے بیر بھٹی کا نام بھی نہ سُنا ہو گا یہاں آئیں گے، چلیں گے، پھریں گے، قہقہے لگائیں گے۔ لیکن فی الحال یہ مٹی، پتھر اور چٹانوں کا ڈھیر ہے۔ جس میں بڑے بڑے درختوں کی ٹوٹی ڈالیاں اور پتوں دار شاخیں آدھی دبی اور آدھی نکلی جا بجا نظر آتی ہیں اور خال خال انسانی ہاتھوں کی بھی کارگذاریوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ اُوپر کی سڑک کا ایک فرلانگ کا پتھر پڑا ہوا سات کا منحوس نمبر آسمان کو دکھا رہا ہے۔ ایک اور جگہ ایک نالی دار ٹین کی چادر کا ایک سرا زمین میں سے خوفزدہ جھانک رہا ہے۔ ملبہ کے بیچوں بیچ نہ معلوم کس طرح اور کیونکر کسی مکان کے برامدے کا ایک لکڑی کا کھمبہ زمین میں آدھا دبا آدھا باہر نکلا ہوا کھڑا ہے۔ اس کے اُوپر بچی کھچی کپڑے کی ایک دھجی چمٹی ہوئی چھوٹی سی جھنڈی کی طرح لہرا رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملینڈ سلاپ نے مہم سر کرلنے کے بعد اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ اس جھنڈے سے کافی فاصلہ پر سسکتے ہوئے انسان کے

بچّے کو اب بھی سینے سے چمٹائے، زخموں سے چُور بندریا تشنج کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ صبح کی روشنی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

دُور سے آواز آتی ہے Now then my Lord پھر بڑبڑاتی ہوئی آواز بڑھتی ہوئی قریب آتی ہے۔ پروفیسر دیا شنکر دوبے صرف کوٹ اور قمیص پہنے بکھر دیتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ آتے آتے اس کھمبے اور جھنڈی کے قریب آتے ہیں۔ رُکتے ہیں۔ اُسے غور سے دیکھکر یوں خطاب کرتے ہیں Now then my Lord مجھے آج آپ سے تعارف حاصل کر کے جو شرف لاحاصل سے ارطباع ہوا ہے وہ نشاط کامل الہامِ غیبی میں بھی میسّر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آج میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ نطق اور خیال کے باہم تصادم کو معدوم البقا ٹھیرا دینا غلطی اور سخت غلطی ہے۔ اس لئے اس خاکسار کی عرض ہے کہ آپ یہیں ٹھیریں اور بندہ آگے جاتا ہے۔

اس عالمانہ مزاج پُرسی کے بعد پروفیسر صاحب جھنڈے کو چھوڑ آگے بڑھ گئے۔ اور جیسے ہی وہ دُور چلے گئے ایک ڈھٹیال نکلی ہوئی چٹان کی آڑ میں سے جہاں وہ دیر سے چھپا بندریا اور بچّے کو دیکھ رہا تھا نکلا۔ مُردہ بندریا کی گود سے بچّے کو اپنی گود میں لے دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ اب پھر خاموشی اور تنہائی ہو گئی۔ بندریا کی لاش پڑی ہے، جانور کی لاش پر کوئی نہیں روتا۔ آہ! قریشی کے اکلوتے لڑکے! لاکھوں کی جائداد کے وارث، تیری لاش پر میں روؤں بلینگ تو مر گیا۔ مکانوں، زمینوں، گاؤں کا مالک قریشی کا لڑکا تو مر گیا۔ بندریا نے اپنی جان دے کر جسے بچا لیا ہے وہ اب ایک جانور کا بچّہ ہے۔ کیونکہ ڈھٹیال اسے پالے گا۔ وہ جئے گا۔ جوان ہوگا۔ مگر ایک دوسرے جنم میں۔ جہاں طرزِ خیال اور ہوگا، جہاں طرزِ تکلم اور ہوگا، طرزِ زندگی اور ہوگا۔ طرزِ معاشرت اور ہوگا۔ تو اپنی جاگیروں سے بے خبر، اپنے مذہب سے ناآشنا، اپنے تمدن سے ناواقف

ڈھٹیال بنا اپنے طبقے کو خوفزدہ دُور سے دیکھا کرے گا۔ اور تیرے اصلی ساتھی تجھ سے اس طرح بچ کر چلا کریں گے گویا تو انسان نہیں ہے۔ بیشک تو نیم وحشی ڈھٹیال ہے۔ اور وہ روشن خیال اور روشن دماغ انسان ہیں۔

انسان کو حیوانیت کے درجے سے نکال کر خدا کی نائبیت کا تاج پہنانے والا، اگر انسان کا عقل سے پُر دماغ ہی ہے تو تعجب ہے۔

کیا در اصل انسان صحیح الدماغ ہے؟

ہندو بن کر نہیں، مسلمان بن کر نہیں، قریشی یا ڈھٹیال بن کر نہیں۔ انسان اور صرف انسان بن کر اے انسان اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ۔ تو آئینہ حیرت ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک

ہر فرعونے را موسیٰ

دن ڈھلتے ہی جنگل کے جانور بیدار ہو کر اپنی اپنی پوشیدہ نشست گاہوں سے نکلنے لگے۔ اور مالا کا وہ جنگل جو دن بھر چوپایوں سے خالی نظر آتا تھا آباد ہو گیا۔ گو چڑیوں کے بسیرا لینے سے خاموشی ضرور چھا گئی۔ لیکن سُنسان سال بنی میں اب جابجا حرکت کرتے ہوئے چوپائے نظر آنے لگے۔ چونکہ دن کی ہلکی ہلکی روشنی اب بھی موجود تھی اور جنگل کے واسطے ابھی بہت سویرا ہی تھا اس لئے سُور، چیتل اور نیل گائے ایسے ہی نیچ ذات جانوروں کی صورتیں فی الحال نظر آ رہی تھیں۔ جو کہ پوری طرح رات نہ ہونے کی وجہ سے قدرے بے خوف اِدھر اُدھر خوراک کی جستجو میں جا رہے تھے۔ اس امن اور خاموشی کے عالم میں ایک بھاری مست اکڑا سور کبھی کبھی اپنی بدطینتی کی وجہ سے کھو کھو، خوک۔ خوک۔ کھو کھو، خوک خوک کر کسی پاس آنے والے جانور پر دوڑ پڑتا تھا اور اس کا دُور تک پیچھا کرنے کے بعد پھر واپس آ کر بھاری تھوتھنی سے موسل کی جڑیں کھودنے میں لگ جاتا تھا۔ سال بنی کے مشرق کی طرف گھنے سال اور نیچے گھنی جھاڑیوں نے بالکل ہی اندھیرا کر رکھا تھا۔ مغرب کی طرف ڈوبتے ہوئے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی اس لئے اب

بھی موجود تھی کہ اُدھر ہی پاس لگا ہوا سال بنی کا کنارہ تھا۔ جس کے اختتام پر بیلوں کے جالوں سے ملے ہوئے کٹھ روکھ کے اُونچے اور کانٹے دار جھاڑیوں کے نیچے درختوں کی تھوڑی سی چوڑائی کے بعد مالا ندی کا چوڑا پاٹ اپنی کیچڑ دلدل اور چھچلے پانی کو ہاتھی چھپواں گھاس میں چھپائے ہوئے ساکت اور بھورا پھیلا ہوا تھا۔ ندی کے اس پاٹ میں بلکہ اس اُونچی گھاس کے سمندر میں جا بجا انتہائی گھنے چھوٹے چھوٹے جنگل کے ٹاپو بھوری گھاس میں سے نکلے ہوئے دُھندلے پڑ رہے تھے۔

بنڈیلے کو مالا کی گھاس کی طرف سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ زمین میں گھسی ہوئی بھاری تھوتنی وہیں مٹی میں دھنسی کی دھنسی رہ گئی۔ کانوں نے آہستہ آہستہ جنبش جاری رکھی۔ آواز پھر بند ہو گئی تھی۔ کچھ دیر اسی حالت میں انتظار کر لینے کے بعد ناک کو دوبارہ مٹی میں جھٹکے سے دھنسایا ہی تھا کہ کھَس کھَس۔ کھساک آواز آ ہی گئی۔ بنڈیلا جڑ کھودتے میں رُکا اور پھر بغیر سر گھمائے، بدن کے ایک ہی جھٹکے میں پوری جان سے گھوم۔ مالا کی طرف رُخ کر، پتلی دُم کی جلیبی بنا، ساکت کھڑا ہو گیا۔ چند جانوروں کی اُونچی اور سوکھی گھاس میں سے نکلنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ نگاہ کے کمزور سور نے سرسراہٹ کی آواز سے ہی آنے والے جانوروں کو تھوڑی سی غلطی کے ساتھ پہچان لیا۔ وہ سمجھا کہ پھر کوئی بدتمیز نیلا مع اپنی گایوں کے واپس آ رہا ہے۔ اس روز کئی نیل گائے اسے ستا چکے تھے۔ دو دو قدم اور دو دو قدم رُکتا ہوا جھکے ہوئے سفید بل کھائی ہوئی کالیوں سے مرصع تھوتنی کو جھٹکے دیتا ہوا اچلا۔ سامنے بل پیچ کھائے ہوئے جنگلی بیلوں کے موٹے موٹے ننگے رسّوں کی طرح جھولوں کی صورت سے لٹکے ہوئے، اونچے درختوں سے جھاڑیوں پر اور جھاڑیوں سے درختوں پر پھیلے ہوئے جال سا بنائے ہوئے تھے۔ اور وہیں ایک جھاڑی کے برابر لٹکی ہوئی بیل کے نیچے مالا کی ترائیوں

دلدلوں اور مالا کی ہاتھی چھپواں گھاسوں کا اصلی باشندہ! زبردست گوند موٹے شاندار سینگوں کی پرچھائیاں بلند کئے، پیچھے رکتی، ٹھٹکتی آنے والی مادینوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

کم عمر نر، پٹھے اور مادینیں ایک ایک کر کے اونچی گھاس میں بنی ہوئی پتلی پگڈنڈی میں سے نکل کر، چوکنی چاروں طرف دیکھتی، رکتی اپنے بچّوں کو ساتھ لیتی بڑھ رہی تھیں۔ اور ایک ایک دو دو کر کے نر کے پیچھے جمع ہو رہی تھیں۔ نر گوند۔ جنگل کا سب سے بڑا چوپایہ۔ اپنے جُثّے اور اپنی طاقت پر مغرور گوند۔ نتھنے پھُلائے، کانوں کی کٹوریاں آگے گھمائے، دُم کی تھاپی تیزی سے ہلاتا، جھنجلایا ہوا کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون گستاخ اور بدتمیز راستہ میں ہے۔ سامنے سال بنی میں نیچے نیچے پودے اور جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ لیکن کوتاہ قد سُور ان میں پنہاں نہ تو خود نظر آتا تھا اور نہ اپنی کمزور بینائی کی وجہ سے خود ہی گوند کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی نیل گائے سمجھے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اور مادینوں کی چاپ کے جب قریب آگیا تو "کھو کھو خوک، کھو کھو خوک" کی جھڑکیاں آمیز آواز نکالتا ہوا لپکا۔

چھوٹی جھاڑیاں اور گھاسوں کو سڑ سڑاتا پھڑ پھڑاتا نکلا۔ گوند سے پندرہ گز کے فاصلہ پر ہوگا کہ دفعتہً اس نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا۔ سامنے زبردست گوند سینگوں کی چمکتی ہوئی سفید نوکیں برچھیوں کی طرح تانے بیخوف کھڑا اسے حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ نیلے اور جھانک ڈرا دھمکا کر بھگائے جا سکتے تھے۔ لیکن گوند؟ گوند؟ توبہ۔ توبہ! بڑھتا ہوا سور کھٹ سے رُکا۔ سٹ سے پورا جسم گھما اور لوٹ دُم کھو کھو۔ کھو کھو کرتا ہوا بھاگا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔

مغرور گوند اکڑتا ہوا خاموش آگے آگے راستہ سے آگاہی کرتا ہوا بڑھا اور اس کے پیچھے نوعمر بچھڑے اور نازک تندرست چکنی مادینیں پٹھے اور شانیں پھڑکاتی، پیر جھٹکتی، گردنیں لچکاتی، بھڑکتی، ٹھٹکتی، کودتی، اچکتی

آپس میں چہلیں کرتی بڑھیں۔ اور اس طرح مالا کے گوندوں کی ڈاروں میں سے ایک ڈار سال بنی میں چلی جس کے سامنے پڑ جانے والے چیتل، پاڑے سُور اور نیل گائے از خود راستہ چھوڑنے لگے۔ گوندوں کی ڈار نے زبردست نر کی حفاظت میں آہستہ آہستہ اطمینان کے ساتھ سال بنی کے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ڈیڑھ میل کی چوڑائی کو پار کرکے موٹر روڈ کے قریب جنگل میں چھپی ہوئی ایک نُنھیاری پر پہنچکر بچّے، پٹھے، بچھڑیاں اور مائیں گڈھے کو چاروں طرف سے گھیر، گردنیں نیچی کر، وہاں کی نمکین مٹی چاٹ چاٹ کر سب مزے لینے لگے۔ بڑے نر نے کچھ دیر علیحدہ ہی کھڑے رہ کر جنگل میں چاروں طرف پھر نظر دوڑائی۔ اور جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ سے بڑھکر جھکی ہوئی مادینوں کے پیچھے ہی سے مٹی چاٹنے کو گردن بڑھائی تھی کہ سال بنی کے مالا کی طرف کے حصّے سے دبی ہوئی آواز آئی "پُر ررر، جُھر، پُر ررر" گوند نے اور اس کے ساتھ ساری ڈار نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ اندھیری رات اور پھر اندھیرا گھنا جنگل۔ جانوروں کے واسطے سُہانی روشنی سے پُر تھا۔ گوندوں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پہاڑ ایسا ہاتھی دو سفید دانت ان کی طرف دراز کئے، سونڈ لمبی پھیلائے اپنی آمد کی اطلاع ان کو دے رہا تھا۔

آدھے منٹ تک ہر گوند پتھر کی مورتی کی طرح ساکت کھڑا بغیر پلک جھپکائے اس سیاہ پہاڑ کو دیکھتا رہا۔ پھر اکبارگی سب کے سب چونکے اور بے ترتیبی سے بھاگ پڑے، بھاگتی ہوئی مادینوں نے ایک قطار بنا اس کے بیچ میں نر کو لے لیا۔

امن اور سکون کی حالت میں نر آگے آگے اُن کے واسطے راستے کے خطرات سے آگاہی کرتا چلتا تھا۔ لیکن بغیر راستہ دیکھے اور بغیر راستے کے حالات معلوم کئے بے تحاشا بھاگنے کی حالت میں نسل کا سلسلہ قائم رکھنے والے نر کی بجائے مادینیں خود اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر نر کو بیچ میں لے کر

بچائے جانے کے واسطے بھاگ پڑیں یہی جنگل کے تمام چوپایوں کا اصول ہو البتہ انھوں نے اتنا ضرور کیا کہ پاس لگی موٹر روڈ پر پہونچکر چلتی ہوئی ہوا کی مخالف جنوب مشرق کی طرف اپنا رُخ کرلیا۔ تاکہ اگر سامنے گھنے بلی کے جنگل میں کوئی دشمن ہو تو اس کی بُو اِن کو آجائے۔

اور جب گوند بھاگ گئے تو نر ہاتھی نے ہلکی سی پیپ پر رور رو۔ پا۔ پو کی آواز نکال کر پیچھے آنے والے غولوں کو راستے کے محفوظ ہونے کی اطلاع دی۔ جس کے تھوڑی ہی دیر بعد سیاہ تودے پنکھے ایسے کان اور اژدہے ایسی سونڈیں ہلاتے جابجا درختوں کے تنوں سے کتراتے ہوئے نکلنا شروع ہوئے۔ ان میں نر، مادہنیں اور بچے سب ہی تھے۔ ہلتے جُلتے پہاڑ چرپٹر، کھڑبڑ ڈالیاں توڑتے، جھاڑیاں نوچتے، سونڈوں میں ڈالیاں گھماتی سُتون ایسے پیروں کو ہلاتے بڑھتے چلے آئے۔ اور موٹر روڈ کو پار کر کے دوسری طرف کے بلی کے جنگل میں گھس کر اس کے بیچ میں چھپی ہوئی پٹیلا جھیل کی طرف بلیاں توڑتے، درخت چرچراتے، خوش ذائقہ پٹیلا کھانے کے لئے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ تر پٹیلے کی بُو ان کو آنے لگی۔ ان میں سے ایک اسکاؤٹ نے آگے بڑھ کر گھنے ساکھو میں سے سر نکال سبز لہلہاتے پٹیلے کے تختے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، پھر سونڈ کی اُٹھی ہوئی نوک چاروں طرف گھما کر بو لی۔ کانوں کے پنکھوں کو ہر ہر طرف گھما دشمن دیگر آوازوں کا پتہ چلایا۔ اور جب سب طرح اطمینان ہو گیا تو اپنے غول کو بڑھنے کے واسطے ہلکے سے بگل میں اطلاع دی۔ بیپ پر ور رور و۔ پا۔ پو۔ ساتھ ہی عاؤں ؤ۔آ۔ او اوہاں خوں۔ شیر کے ڈانٹنے کی کرخت آواز آئی۔ زمین ہل گئی۔ جھاڑیاں لرزیں۔ درخت تھرائے، ہاتھی بُری طرح گھنے بیٹلے بلی کے جنگل کو توڑتے کچلتے واپس بھاگے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پچھلی رات کا چاند نمودار ہو کر اوس ٹپکاتے گھنے ساکھو کے سُتواں سیدھے درختوں پر سے جھانکتا ہوا اپنی زائل ہوتی ہوئی ہلکی روشنی چھچلی خشک جھیل میں اُگے ہوئے نیچے گھنے پٹیلے پر ڈال رہا تھا، اور اونچے، گھنے، ساکت، خاموش سیاہ جنگل نے چاروں طرف گھری قدرے روشن پٹیلے کے ایک کنارے جنگل کی ٹیٹری بالس ڈیڑھ بالس اونچی پھرپھراتی ہوئی بول رہی تھی "ٹٹ ٹیٹ۔ ٹیٹی ٹیٹی۔ ٹٹ ٹیٹ۔ ٹیٹی ٹیٹی ٹیٹی" لیکن جونہی شیرنی نامعقول ہاتھیوں کو ڈانٹ بتا کر اونچے درختوں میں سے نکلی ٹیٹری "ٹٹ ٹیٹ۔ ٹیٹی ٹیٹی ٹیٹی" کی آخری چیخ بھرتی ہوئی پھیلے پٹیرے کے شمال کی طرف نیچی نیچی اُڑتی چلی گئی اور وہیں غائب ہو گئی۔ دس فٹ لمبی دھاریوں دار شیرنی، خود لچکتی، دُم لچکاتی پٹیرے میں کچھ دور گئی۔ اور پھر رُک گئی۔

وہاں سامنے جنگل سے سوا سو گز کے قریب، دُور کچلے ہوئے پٹیرے میں شیرنی کے واسطے عجیب مسرت انگیز نظارہ تھا۔ شیرنی کے دو نوعمر بچے گوند کی ایک اَدھ مری کی ہوئی مادہ پر چمٹے ہوئے تھے۔ ایک، گری ہوئی مادہ کی پیٹھ کے پاس کھڑا ہوا اپنے دونوں اگلے پنجے اس کی کمر پر جمائے، برابر اٹھنے کی کوشاں گوند کو پھر گرا گرا دیتا تھا۔ اور دوسرا موٹی گردن چھوٹے جبڑوں میں دبائے اپنی پوری طاقت سے اسی طرح جھٹکے دے رہا تھا جس طرح پورا شیر دو ہی جھٹکے دیکر گردن کی گری گری الگ کر دیتا ہے۔ شیرنی نے پہلے ہی سے اپنے بچوں کو شکار کی تعلیم دینے کے واسطے گوند کی گردن توڑ اَدھ مرا سا کر دیا تھا۔ اس کا سر گردن پر جھول رہا تھا، لیکن پھر ذبح کئے ہوئے مرغے کی طرح ڈگمگاتا سر اُٹھا وہ اُٹھ بھاگنے کی کوشاں تھی۔ جیسے ہی پیٹھ پکڑے بچڑے گرانے والا بچہ اُدھر سے کچھ ہٹ گُتھے پر منہ مارنے میں مشغول ہوا۔ بسمل گوند نے پھر زور کیا۔ چاروں ہاتھ پیروں پر بیٹھ گئی۔ جو بچہ

گردن میں چپکا تھا گردن میں لٹکنے لگا۔ گرفت چھوٹ گئی۔ جھٹ چار گز پیچھے ہٹ
داؤں لگا، جست کیلئے دبک گوند کے بھاگنے کا منتظر ہو بیٹھا۔ پُٹھے پر کے بچے
نے اگلے پنجے کے ناخونوں، اور دانتوں کے کیلے وہیں گھسا دیئے تھے۔ جیسے
ہی گوند ڈگمگاتی ہوئی کھڑی ہوئی اس نے پچھلے پیروں کے پنجے بھی اوپنچے
کر کے ران پر جمالئے۔ اور چھپکلی کی طرح چمٹ گیا۔ بچّہ گونا زی کتّے کے برابر
تھا۔ لیکن گائے کے قد کی گوند کے واسطے اس کا وزن کیا چیز تھا۔ موت کے
آخری جھٹکے، بھڑکے ہوئے گرم خون کا جوش! ع

بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

خون میں لت پت، نتھنوں سے دھاریں چلتی ہوئیں، دائیں سے بائیں
اور بائیں سے دائیں گرتا ہوا، سر اٹھی ہوئی گردن پر۔ گوند دو نہایت مخدوش
دولتیاں چلا کر ڈلکی بھاگی۔

تماشا دیکھتی ہوئی شیرنی نے فوراً جہاں کھڑی تھی وہیں کے وہیں بدن سکیڑ
سینہ اور پیٹ زمین سے ملا، چاہا کہ گوند پر جست کرے۔ لیکن بجلی کی طرح دوڑا
بچّہ ہوا میں معلّق نمودار ہوا۔ اس کی دُم اور پیر پیچھے پھیلے ہوئے تھے۔ اگلے ہاتھ
گردن کے متوازی آگے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح
بھاگتے ہوئے گوند کی کمر پر گرا۔ دھماکے کی آواز آئی۔ گوند پھر زمین پر دراز
ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ اور دونوں بچے پھر پچھلے پیروں کی زد سے بچے، اس پر
چمٹے ہوئے تھے۔ شیرنی نے اطمینان کا سانس لیا، سیدھی کھڑی ہوئی۔ اور
انتہائی غرور کے ساتھ آہستہ آہستہ بچوں کی طرف بڑھنے لگی۔

لیکن جنگل سے چاروں طرف گھرے ہوئے پٹیلے کے مغرب سے چلتی ہوئی
ہوا میں بُو آئی اور پھر آہٹ ہوئی۔ قدم بڑھاتی ہوئی شیرنی اُٹھا ہوا اگلا پیر
اٹھائے ویسے ہی رُک گئی۔ نہ خود گھومی نہ سر گھمایا۔ ویسی ہی خاموش کھڑی
رہی۔

ہلکی ہوا میں جُھکا اہند کی بُو تھی۔ بھاری پیروں کے پھسا کے کی آواز تھی۔ پھر گستاخ بدتمیز ہاتھی اس طرف کی جرأت کر رہے تھے۔ ملکۂ دشت برہم ہوئی۔ آنکھوں میں بجلیاں، پنجوں میں خنجر ہائے خمدار نمودار ہوئے۔ گھومی ہوئی دُم سیدھی پھیل گئی۔ خونخوار دہانہ زمین سے مل گیا۔ اور دہاڑ! ۔ بھاری گھمبیر ہر طرف پھیلی ہوئی دہاڑ نے چاروں طرف کے جنگلوں کو کپکپا دیا۔ شیرنی غلطی پر تھی۔ اس مرتبہ ہاتھیوں کا غول نہ تھا بلکہ صرف ایک ہی ہاتھی تھا۔ ایک کانا ہاتھی۔ مست دیوانہ۔ ڈیڑھ دانت کا۔ پہاڑ قامت، خونی اکڑ ہاتھی۔ وہ ہاتھی جو باوجود آدھا دانت لڑائیوں کی نذر کر دینے کے تمام ہاتھیوں کو شکست دے چکا تھا۔ وہ ہاتھی جو باوجود ایک آنکھ گولی سے ضائع ہو جانے کے تمام شکاریوں کو ہرا چکا تھا۔ وہ ہاتھی جو دُنیا کے تمام جانداروں سے برسرِ جنگ، ہر ہستی کے خون کا پیاسا پھرتا تھا۔ اس کے ساڑھے گیارہ فٹی کے قد میں نہ صرف بے اندازہ قوت پنہاں تھی بلکہ ڈیڑھ سو برس کی زندگی نے قوت کی اجتماع کے ساتھ ایک صدی سے اوپر کے تجربوں سے پُر، جابر، ظالم، بے رحم، چالاک اور مکّار دماغ بھی اسے عطا کیا تھا۔ وہ جس قدر جُثے کا مالک تھا۔ اسی قدر اس وزن کے استعمال کرنے کے طریقوں سے بھی آگاہ تھا۔ شیرنی کی جنگل دہلا دینے والی دہاڑ اس نے سکون اور اطمینان کے ساتھ سونڈ کی نوک منہ میں دبائے ہوئے اور اُٹھے ہوئے پچھلے ایک پیر سے دوسرا پیر کھجاتے ہوئے سُنی۔ اس کی بائیں طرف کی پھوٹی ہوئی آنکھ جس میں سے دائمی سیاہ بہنے والے آنسوؤں سے منتھ پر ایک کالی لکیر بنی ہوئی تھی اپنے دید سے خالی گڑھے پر چھپائی۔ اور سالم آنکھ کے چھوٹے سے گول ڈھیلے نے چاروں طرف، اوپر اور نیچے کئی چکر لگائے۔ کانا ہاتھی گھوما اور آہستہ آہستہ بغیر آہٹ کئے واپس لوٹا۔ پیڑ سے قریب دو گنا دور جا کر آہستہ سے دبی ہوئی پُر زور درد آواز نکالی اور اس

کے بعد گھنے ساکھو کے اندر ہی اندر پیڑ سے دور ہٹتا ہوا، نصف دائرے میں چکر کھا، جھیل کے مغرب کی طرف پہونچکر احتیاط سے دبے پاؤں کناری کے پاس آکر ایک بہت موٹے درخت کی آڑ میں رُک کر انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بیخبر شیرنی مری ہوئی گوند کمر سے مُنہ میں اٹھائے، پٹیرے سے سال بنی میں داخل ہوئی۔ بھاری گوند کو شیرنی نے اس طرح منہ میں اٹھا رکھا تھا جیسے بلی چوہے کو اٹھا لیتی ہے۔ البتہ اس کی گردن اور پیر لٹکے ہوئے زمین پر گھسٹ رہے تھے۔ اور دونوں بچے گھسٹتے ہوئے اعضا کو کبھی ادھر سے اور کبھی اُدھر پکڑ کر گھسیٹتے اور جھٹکے دیتے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ شیرنی انکی اس بے موقع کارگزاریوں سے قدرے جھنجلائی۔ ہلکے ہلکے غراتی دائیں بائیں کتراتی۔ اونچے سال بنی کے نیچے چھدری اُگی ہوئی جھاڑیوں میں چلی آرہی تھی کہ دفعتہً اس کو درختوں کے چار تنے اپنی جگہیں چھوڑ تیزی سے حرکت کرتے معلوم ہوئے۔ اور قبل اس کے کہ وہ گوند کو رکھ کر اوپر دیکھنے کو سر اٹھائے ایک نیز دل بھیانک چنگھاڑ سے کان کے پردے تھرتھرانے لگے۔ شیرنی کی اٹھتی ہوئی نگاہیں سامنے کھڑے ہوئے ہاتھی پر گزوں اٹھتی چلی گئیں۔

شیرنی نے دیکھا وہاں سیاہ بے ہنگم بھوت گزوں اُونچے سے بھی گزوں اُونچی سونڈ اٹھائے دیوار کی طرح سامنے کھڑا، اٹل، جنگ کا پیغام دے رہا تھا۔ شیرنی کے سامنے اس کا شکار اور دائیں بائیں اس کے نوعمر اور ناتجربہ کار بچے تھے۔ خطرہ اور فوری خطرہ سامنے تھا۔ خون میں ہیجان آیا، رگیں تھرائیں، پٹھے سکڑے اور آناً فاناً ہیں، قہر کا شعلہ تھا کہ جرأت کی بجلی تھی، جو زمین سے چھٹی اور پہاڑ ایسے دشمن کے بالشتوں اُٹھی ہوئی سونڈ تک پہونچی۔ ہوا میں معلق شیرنی چاہتی تھی کہ گرفت میں لاکر اس اُٹھی ہوئی سونڈ کو جبڑوں سے چبا ڈالے اور پنجوں سے جھبر جھبر کر ڈالے۔ لیکن اُٹھے ہوئے

سونڈ کے اژدہے نے ناگن کی طرح بل کھایا۔ موت کا سیاہ لٹھا سامنے سے لچکا، بازو میں آیا۔ اور کئی من کا مُگدا شیرنی کی پسلیوں پر گھم سے پڑا۔ بعد سے شیرنی زمین پر گری، ہاتھی لپکا۔ سیدھے پیر کی فنا کن ٹھوکر چلائی، مگر وہاں جگہ خالی تھی۔ پھرتی کا مجسمہ شیرنی کندھے پر چمٹی سخت کھال میں دانت اور ناخن گھسا رہی تھی۔ ہاتھی نے جھرجھری لی اور دو جھٹکے اپنے بدن کو اس قدر سخت دیئے کہ شیرنی کی گرفت چھوٹ گئی۔ وہ پھر تین گز پر گری۔ اور ساتھ ہی کچل کر نقشِ زمین کر دینے والا سولہ من کا پیر اسٹیم ہیمر کی طرح اس جگہ پڑا جہاں شیرنی گری تھی۔ مگر پھرتیلی شیرنی ہٹ چکی تھی اور خیال، کی تیزی کے ساتھ اب گردن کے پٹھے کو بھنبھوڑ رہی تھی۔ ہاتھی نے پھر اپنے بدن کو سخت جھٹکے دیئے لیکن بیکار۔ شیرنی نے دانتوں کے ہیبت قبضے اور ناخنوں کے نشتر سخت کھال میں انچوں پیوست کر دیئے تھے۔ ہاتھی باوجود کرب اور تکلیف کے لمحہ بھر کو خاموش ہوا۔ پھر اطمینان کے ساتھ نصف دائرے میں گھوما۔ ننھی ننھی مکار آنکھ نے اپنا کام کیا۔ ایک زبردست درخت کو تاک لیا۔ ہاتھی آہستہ آہستہ اسکی طرف کھسکا، اور پھر قریب پہونچتے ہی پھرتی سے جھپٹا۔ چار فٹ موٹے درخت کے تنے اور سینکڑوں من بھاری ہاتھی کے جسم کا ایک شکنجہ تھا جس کے بیچ میں شیرنی کی ہڈیاں اور پسلیاں چرچرا رہی تھیں۔ آخری جانگسل چیخ شیرنی کے منہ سے نکلی۔ جنگل گونج گیا۔

کانا ہاتھی بڑی دیر تک شیرنی کی لاش کو درخت اور اپنے جسم سے دبائے رگڑ رگڑ کر کچلتا رہا۔ اور جب بالکل ہی اطمینان ہو گیا تو شیرنی کی چپٹی لاش کو پچھلے پیروں سے ٹھکراتا رہا۔ اور پھر پیر سے دبا اور سونڈ سے پکڑ چاروں ہاتھ پیر چیر چیر کر اِدھر اُدھر اُچھال دیئے۔ اور اس پر بھی جب جلال کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لوتھ دھڑ کو فٹ بال کی طرح ٹھکراتا ہوا سال بنی کو مشرق کی طرف چل دیا۔ اور مزروعہ سے ملے جنگل کے کنارے کنان کے ایک

ٹکڑے میں پہنچ گیا۔ جہاں کٹان اور سلیپر چران کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں دو تین درخت گرائے جا چکے تھے اور دو تین آرہ کش بھی آکر شگون کے طور پر کام شروع کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ ابھی پوری طرح مدد نہ آئی تھی، اس لئے یہاں کانے ہاتھی کو برباد کرنے کے واسطے چند نامکمل منڈیوں کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ یہ ان ہی کو دل بھر کر روندنے کے بعد تھوڑا سا پھونس سر پر اچھال اور تھوڑا پھونس مُنہ کے ایک کونے میں دبا۔ چھپروں کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی سونڈ میں لے آگے مزروعہ میں لہلہاتے گیہوں چرنے چل دیا۔

ہر شب کے معمول کے مطابق دس بارہ میل کی چہل قدمی کے بعد چران کے ٹکڑے سے نکل کانا ہاتھی صبح تین بجے کے قریب پیپریا گاؤں کے جنوب کی طرف جنگل کے کنارے آنکلا۔ جنگل سے باہر مزروعہ زمین کے کنارے کنارے میلوں لمبی کانٹے دار ڈالیوں، ٹہنیوں اور جھاڑیوں سے بنائی ہوئی دیوار اس کے واسطے کوئی رکاوٹ ہی نہ تھی۔ سونڈ نیچے ڈال کر آہستہ سے جھاڑ کی دیوار گزوں کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ اور پھر گز بھر اونچے ہرے لہلہاتے گیہوؤں میں کھڑے ہو کر ایک ایک وقت میں بوجھ بوجھ کے پودے سونڈ میں لپیٹ جھر جھر جڑوں سمیت نوچنا شروع کر دیئے اور ان پودوں کو سونڈ میں ہلا ہلا کر اگلے پیر مارتے ہوئے جڑوں کی مٹی جھٹک گرد و بہر آگر کے مُنہ میں رکھنا اور مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ اس قدر خودی کے گھمنڈ میں کھویا ہوا تھا کہ تھوڑی دیر پیشتر شیرنی کے ہلاک کرنے کے کارنامے کو بھی اپنی طاقت کا ادنیٰ کرشمہ سمجھے ہوئے ایک معمولی واقعہ کی طرح فراموش کر دینے کا کوشاں تھا۔ وہ دُنیا کی تمام طاقتوں سے بے خوف کھیت میں کھڑا گیہوں کے پودوں پر پودے نوچتا، جھٹکتا اور چر چر کھاتا چلا جا رہا تھا، اسکے پیر دن میں اور اس کی پشت پر گزوں

کھیت سبز گھنے پودوں سے خالی ہو کر پیروں کے گول گول گڑھوں سے
کھُند چکا تھا۔

شامت جو آئی تو اس سے کچھ دور مچان پر سوئے ہوئے ایک رکھوالے کی آنکھ کھُل گئی۔ چر مر چھر آوازیں سُنیں۔ سمجھا کہ سور گھس آئے ہیں۔ صبح ہونے کو تھی۔ سردی پڑ رہی تھی۔ رضائی اور کملیا میں لپٹا پڑا تھا۔ ویسے ہی پڑے پڑے آواز لگائی "دھو اُلالا۔ دھو آآ" اور پھر خرّاٹے لینے لگا۔

ہتھیار ہاتھی اس آواز کے سُنتے ہی سہم ہو کر رہ گیا۔ کئی منٹ آدھا پولا منہ میں اور آدھا سونڈ کی نوک میں پکڑے کھڑا رہا۔ پھر پولا منہ سے نکال دیا۔ پھینک سونڈ کی نوک پولے کو آگے بڑھائی۔ کان کھڑے کیے اور آہستہ آہستہ مچان کی طرف بڑھا۔ پاس پہنچ کر پھر خاموشی سے خرّاٹے سُنے۔ ایک ایک قدم کر کے مچان تک گیا۔ لمبی سونڈ اُٹھا کر مچان پر رکھی۔ آہستہ سے سوتے ہوئے آدمی کے پیر مع لحاف کمبل اور گاڑھے کی سوزنی کے لپیٹ کر مچان سے اسے کھینچ لیا۔ ہوا میں دو بڑے بڑے جھکولے دیکر بستر اسے دو دفعہ زمین پر پٹکا اور پھر پیروں میں دبا کر چرا چر لحاف کمبل وغیرہ چیر ڈالے۔

آدمی ان میں اب نہ تھا۔ وہ پہلے ہی جھولے میں تکیہ کی طرح اپنے غلاف میں سے نکل دُور جا گرا تھا۔ شکاری کلو پاسی کا لڑکا بدّل گو ابھی نوجوان ہی تھا، لیکن بچپنے سے اب تک جنگل کی آغوش میں رہا تھا۔ نو دس برس کی عمر سے شکاریوں کے ساتھ جانے اور جنگل میں مویشی چرانے سے اس کے حواسِ خمسہ حواسِ عشرہ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جیسے ہی ہاتھی نے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اس کے پیر کھینچے کسی نامعلوم حس نے اس کو خطرے کی اہمیت سے آگاہ کر دیا۔ اس نے سانس کھینچ لیا۔ بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور جب وہ بستر کے خول میں سے نکل بھد سے کھیت سینچائی کی دلدل میں گرا تو اس نے چوں نہ کی بلکہ ویسے ہی بے حس پڑا ہر ہر آواز کو غور سے سُنتا رہا۔ چرا چر

کپڑوں کے چیرنے اور پھاڑنے کی آوازیں سُنیں۔ پھر پھنکار سے ملتی اطمینان کی سانس سنی۔ اور اس کے بعد پیروں کے پھسا کے سُنے۔ اور جب یہ پھسا کے کافی دُور سے آنے لگے تو پھر کیچڑ میں اوندھے پڑے ہی پڑے آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں کے بَل اونچے ہو کر صبح کی ہلکی روشنی میں سیاہ دُل، دیو قامت ہاتھی کو جنگل میں گھستے اور غائب ہوتے دیکھا۔

جب یہ کسرتی گبرو جوان کیچڑ میں پڑے ہی پڑے ہاتھوں کے بَل اگلا دھڑ اٹھائے ہوئے گیہوؤں کے پودوں کے اُوپر سے ہاتھی کو دیکھ رہا تھا تو وہیں اس کے پچاس قدم پیچھے مُنڈیر پر کھڑا ہوا ایک اور گانوں کا لڑکا جھبلئی اس کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس ہم عمر، کمزور، بُزدل اور مکّار جھبلئی نے مسکراتے ہوئے آواز دی ''ارے واوا! تم اِتّے لکے ہو۔ آئے جاؤ۔ ترس، آؤ میں ٹھاڑا ہوں''

بدّل نے سر گھما کے جھبلئی کو دیکھا۔ تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ گو کمر میں سخت جھٹکے کی وجہ سے بہت تکلیف تھی۔ لیکن فوراً ''ٹھاڑا رہیو آت ہوں'' کہتے ہوئے بڑی تیزی سے مُشتہر کرنے کیلئے گاؤں کی طرف روانہ تھے۔

جوں توں بہادر بدّل گاؤں پہنچ گیا۔ کمر کی مالش کی گئی۔ سکائی ہوئی دو چار دن میں ٹھیک ہو گیا۔ لیکن بیکار کی بدنامی اس کی ہو چکی تھی جس کا علاج اس کے پاس نہ تھا۔

چونکہ میجر پوسٹ کچھ عرصہ افریقہ میں رہ چکے تھے۔ اور چونکہ اُن کی محبوبہ منگیتر لوئس غزور سے مسکراتی ہوئی حاضرین کی طرف دیکھ دیکھ کر اُن کے قصّے سُنایا کرتی تھی۔ اس لئے میجر پوسٹ کیلئے کلب میں بیٹھ کر افریقہ اعظم کے بے پایاں جنگلوں اِن مہیب وحشی جانوروں کے خطرناک شکار کے قصّے بیان

کرنا ضروری تھے جن کے سُننے سے دل کانپ جائے، رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور عقل خبط ہو جائے۔ اور جب ایسا ہوتا ہی تھا تو ایک دن ایسا بھی ہوا، کہ ٹھیک اس وقت جبکہ میجر ہاتھیوں کے شکار کا ایک ایسا واقعہ جس میں ان کے دو بندوق بردار چار قلی چھ کے چھ ہاتھیوں کے پیروں میں روند کے اور سونڈوں سے چر کے ختم ہو گئے تھے۔ بیان کر ہی چکے تھے۔ اور آٹھ دس حاضرین جن میں دو اور لیڈیز بھی تھیں، ششدر خاموش بیٹھے تھے تو ایک نوعمر لفٹننٹ نے اُٹھ کر جیب میں سے "ٹائمز آف انڈیا"، کا ایک تہ کیا ہوا صفحہ نکالا اور اسے اطمینان سے کھول کر سیدھا کیا اور پھر کہا "آپ لوگ سُنیں، پرسوں کے اخبار میں ایک اشتہار تھا۔ شاید آپ لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو" اس نے کنزرویٹر آف فارسٹس یو۔پی کا وہ اشتہار پڑھا۔ جس میں پیلی بھیت ڈویژن کے کانے خونی ہاتھی کے مارنے پر پانچ سو روپے کا انعام مشتہر کیا گیا تھا۔

چنانچہ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن میجر پوسٹ مع اپنی چھ بندوقوں اور چار ملازموں اور تین بیل گاڑی سامان کے، ملازموں کو ہندوستانی کُتا کہتے، خود سفید فاکس ٹیریر کی زنجیر تھامے، مالا اسٹیشن پر اترے۔ حسبِ ہدایت ازافسرانِ بالا فارسٹ گارڈ مع قلیوں اور بیل گاڑیوں کے موجود تھا۔ اسٹیشن سے سامان لادا گیا اور جنگل کی کوٹھی میں اُتار دیا گیا۔ جہاں صاحب بہادر نے تمام تر اطمینان اور آسائش کے ساتھ سکونت اختیار کر لی۔ اور صبح سے شام تک اسپر اگس، سارڈین، سایسجز، فروٹ سیلڈ، سینڈوچز کریم وغیرہ ایسے اقسام کے ڈبے کھلنے اور خالی ہو ہو کر پھنکنے لگے۔ اور دودھ، انڈے، مرغی، تازہ مچھلی، ڈبل روٹی اور ڈاک کی فراہمی کیواسطے طرح طرح کے پیادے اطراف میں دوڑنے لگے۔ اور میجر پوسٹ خود اخبار پڑھنے، خطوط دیکھنے، ان کے جوابات لکھنے، شیو کرنے، بال بنانے اکی ہی غسل

کرنے اور متعدد لباس پہننے، ایسے اہم مشاغل جن میں کہ بار بار کئے ناشتے اور کھانے بھی شامل تھے مصروف ہونے کے باوجود صبح اور شام ایک دو گھنٹے شکار کے واسطے نکال کر اکثر چگتی ہوئی مرغیاں اور جنگل میں سے جھانکتے ہوئے چیتل مارنے لگے۔ اسی طرح آٹھ دن گذر گئے۔ اس عرصہ میں ایک دن ایک کالا تیتر بھی انھوں نے مار لیا تھا۔ اور کوٹھی سے چار میل کی فاصلہ پر ایک کھیت میں مہینہ بلکہ سوا مہینہ پرانے ہاتھیوں کے پیروں کے نشان بھی دیکھ آئے تھے۔ غالباً شکار کے لحاظ سے میجر بوسٹ کی سرگرمیاں بس اسی حد تک محدود رہتیں۔ اور چار دن اور گذر جانے کے بعد وہ پھر ایک دفعہ ڈیم فول کی بوچھاریں بجنی نوکروں، فارسٹ گارڈوں اور ریلوے ملازموں پر اڑاتے ہوئے مالا اسٹیشن سے روانہ ہو کر بریلی پہونچ جاتے لیکن اتفاقاً بدّل کو پتہ چل گیا کہ ایک لال کرتی کا لال منہ والا صاحب کوٹھی میں شکار کھیلنے کیلئے ٹھیرا ہے۔ یہ تو خار کھائے بیٹھا ہی تھا۔ دوسرے ہی دن صبح چار بجے بلم ہاتھ میں لے گھر سے چل دیا۔ اور مالا ندی کے کنارے کنارے پیروں کے نشان دیکھتا ہوا میلوں نکل گیا۔ دن چھپے گھر واپس آیا تو باپ نے پوچھا "ارے کہاں رہا رے؟"

بدّل بولا "کوٹھی میں جو صاحب ٹھیرا ہے اس نے شکار کھلانے کو رکھ لیا ہے۔ مرغی، جھانک مارتا ہے"

اب صرف اس امید پر کہ شاید ان ایام میں کانا ہاتھی پھر اس طرف نکل آئے، یہ روزانہ مالا کے کنارے کنارے کھوج میں روانہ ہو جائے۔ آخر چوتھے روز گاؤں سے چار میل کے فاصلہ پر کانے ہاتھی کا کھوج مل ہی گیا۔ یہاں پھر اس نے پچھلی رات کھیت چرے تھے۔ اور صبح ہوتے تین میل چوڑے جنگل میں سے ہو کر مالا ندی میں گھس گیا تھا۔ جہاں کسی نہ کسی ٹاپو میں دن بھر قیام کر کے دوسری رات پھر کسی اور طرف نکل جانا اس کیواسطے

ضروری تھا۔ بدّل اس کا کھوج پاتے ہی بھاگتا ہوا گاؤں واپس آیا۔ یہاں آکر زمیندار کی گھوڑی نظر آگئی۔ جھٹ پٹ کمل اس پر کس، سوار ہو۔ سیدھا پھر کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ سرپٹ گھوڑی دوڑاتا جس وقت کوٹھی پہونچا تو دس بجے کا وقت تھا۔ صاحب بہادر بندوقیں، جھولے، تھرماس، دوربین، کیمرہ وغیرہ ایسی ہی ضروری چیزیں ہاتھی کے شکار کے واسطے تین مزدوروں پر لادے ہوئے روانہ ہو رہے تھے۔ اس نے جاتے ہی دوہرے ہو کر ہاتھ زمین سے لگا کر سلام کیا۔ اور کہا کہ کانے خونی ہاتھی کو میں تلاش کر کے آیا ہوں۔ اب دیر نہ کی جائے، فوراً چلا جائے۔ لیکن صاحب بہادر نے باوجود اس کے جلدی مچانے کے آدھا گھنٹہ پوچھ گچھ میں لگا دیا۔ "کے ہاتھی ہیں؟ کانا ہاتھی بھی اُن میں ہے؟ کیسے جنگل میں ہیں؟ اس جنگل میں ایسے مضبوط درخت بھی ہیں جن پر چڑھ کر نشانہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتنی دور جانا ہے؟" وغیرہ سوالات کئے۔ بدّل شکاری کی صورت اور سامان دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کس قسم کا شکاری ہے۔ لیکن پھر بھی لال کُرتی کا بریلی کا صاحب تھا۔ اس کی بھاری بھاری بندوقوں کا اعتبار کرتے ہوئے اس نے جھوٹے سچے جواب دے کر صاحب بہادر کو فوراً چلنے پر راضی کر لیا۔ صاحب گھوڑی پر سوار ہوئے۔ ۴۰۰/۳۲۲ بور کا رائفل بدّل کو دیا گیا۔ اس کا بھرنا چلانا بتایا گیا۔ دوسرے دو اور جوڑی کے ڈبل بیرل ۴۵۰ بور ایکسپریس رائفل دو اور مزدور کو دیئے گئے۔ اور یہ لوگ گھوڑی کے آگے اور پیچھے کبھی بھاگتے اور کبھی تیز قدم چلتے ہوئے روانہ ہوئے۔ بدّل نے میل ہی بھر کے بعد جنگل کا کنارہ پکڑ لیا۔ اور اس طرح گاؤں کو اُلٹے ہاتھ پر چھوڑ کر جنگل ہی جنگل لئے چلا جا رہا تھا۔ ابھی اس کو تین میل اور جانا تھا کہ اب صاحب بہادر کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ بہت ہی زیادہ بگڑ کر دریافت کیا کہ "آخر کہاں تک چلنا ہوگا؟" وہ ابھی تک اسی خیال میں تھے کہ میل دو میل کی بات ہے۔ اس کے

اختتام پر کالے ہرن کی طرح نشانہ بنا کھڑا ہوا ہاتھی آجائے گا۔ چاند ماری کے معرکہ آرا صاحب بہادر دُور ہی سے اُسے دیکھ کر پٹ سے اسے گرالیں گے۔ لیکن یہاں کچھ اور ہی نکلا۔ اور جب اس دوش کو پورا کر چکے تو پہونچے کہاں ہاتھی کے پیروں کے نشانوں پر۔ اب جنگل میں گھسنے کی باری آئی۔ صاحب بہادر لگے ہاتھ پیر پھیلانے اور سوالات کرنے۔ بدل نے پھر سبز باغ دکھائے کہ بس اب کیا ہے۔ آپہونچے ہیں۔ مارلیا سالے کو۔ غرضکہ ایک آدمی تو گھوڑی لیکر گاؤں واپس بھیجا گیا اور باقی دونوں کے ساتھ اب پیدل چلائی شروع ہوئی۔ آگے آگے بدل، بیچ میں صاحب پیچھے قلی، پھر تیز تیز روانہ ہوئے۔ ایک ٹکڑا سال بنی کا آیا، دوسرا آیا۔ وہ بھی ختم ہو گیا، تیسرا شروع ہوا۔ راستہ نہ آج ختم ہوتا ہے نہ کل۔ ہاتھی کا محلہ ہی نہیں آتا۔ شروع میں تو سال بنی میدان کی طرح نیچے صاف تھی۔ پھر فٹ، ڈیڑھ فٹ اونچے پودے جھاڑیاں گھانسیں شروع ہو گئیں۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ اونچے سال کے درختوں کے نیچے اُگی ہوئی جھاڑیاں سر فٹوں اونچی تھیں۔ تین چار گز سے آگے کا کچھ نظر آنا تو ممکن ہی نہ تھا۔ اب میجر بوسٹ کی یہ حالت تھی کہ نہ آگے بڑھتے سمجھ میں آتا تھا نہ لوٹتے۔ ہر لمحہ اور ہر طرف سے ہاتھی کی سونڈ پتوں میں سے نکل کر ان کو دبوچتی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر غضب یہ تھا کہ بدل بڑے ہی اطمینان بخش لہجہ میں صاحب کو یقین دلاتے جاتے تھے کہ بس اب تو بالکل نگیچ (نزدیک) ہے ہاتھی۔

خدا خدا کر کے دفعتہً یہ جنگل ختم ہو گیا۔ سامنے مالا ندی کا بھوری گھانس سے پٹا ہوا چوڑا پاٹ پھیلا ہوا تھا۔ جس میں کہیں کہیں گہرے سبز جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ٹاپو دکھائی دے رہے تھے۔ ندی کے کگارے کے نیچے ہاتھی چھپواں بھوری گھانس سنسناتی معلوم ہو رہی تھی۔ پشت پر گھنے جنگل میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ اور اس میں سے رُک رُک کر کُٹ۔ کُٹ۔ کٹ کٹ

ٹُٹ ٹُٹ۔ کھٹ کھٹ بڑھئی کی آواز آرہی تھی۔ دن ڈھلنا شروع ہوگیا تھا دو بجے کا وقت تھا۔ یہاں تینوں دم لینے کو ٹھیرے۔ میجر بوسٹ نے انتہا سے زیادہ لال مُنہ کا پسینہ بار بار پونچھتے ہوئے آگے کی گھانس اور پیچھے کے جنگل کو بُری نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد شکاری تھیلے میں سے برانڈی کی چھوٹی بوتل نکال کر مُنہ سے لگائی۔ چند گھونٹ لئے لمبی سانس لی۔ اور پھر چند گھونٹ لئے۔ سگار نکالا، اس کو جلایا، دس بیس کش اس کے لئے۔ جب جاکر پھر چلنے پر آمادہ ہوئے۔ اب روانہ ہونے سے پہلے بدّل نے صاف بتادیا کہ بس اس گھانس کے اندر جس ٹاپو میں یہ پیر کے نشان گئے ہیں، وہیں ہاتھی ہوگا، ہوشیار رہنا۔ پھر وہی آگے آگے بدّل بیچ میں صاحب، پیچھے مزدور۔ ایک دونالہ ۵۷۷ بور رائفل صاحب کے ہاتھ میں، دوسرا بھرا ہوا پیچھے مزدور کے ہاتھ میں۔ ہاتھی کے پیروں سے کھدی ہوئی گھانس کبھی خشکی کبھی پانی اور کبھی کیچڑ اچل پڑے۔ گھانس کا گھن اور اونچائی ایسی تھی کہ اس میں غرق ہوگئے۔ بلکہ یہ معلوم ہوا کہ گدلے پانی میں ڈبکی لگاکر اندر ہی اندر جارہے ہیں۔ اپنے سے ایک فٹ بھی اِدھر اُدھر حتیٰ کہ اوپر بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جوں توں اس گھانس کے سمندر کو پار کیا۔ وہ ٹاپو۔ یہاں پھر ایک دفعہ گھنا سرسبز جنگل فرنوں اور پھولوں سے آراستہ آگیا۔ لیکن اب اس کا گھن اس بلا کا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے سے صاحب نے قطعی انکار کردیا۔ اور پھر جبکہ یہ بات بھی یقینی تھی کہ خونی ہاتھی ضرور بالضرور اسی چھوٹے ٹاپو میں ہے عقل نے آگے بڑھنا گوارا ہی نہ کیا۔ دل کی حرکت آٹھ روپئے گز اُونی سن پروف سرج کو عبور کرکے ظاہر ہونے لگی۔ صاحب بہادر دونوں ٹانگیں چیر کے ثابت قدمی سے وہیں کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے دونوں ڈبل بور بھرے ہوئے رائفل سامنے درخت کے تنے سے لگاکر کھڑے کردیئے۔ اپنے مقدّر کو کوسا۔ اپنے کو کوسا۔ بدّل کو انگریزی زبان کی تمام تر گالیاں

بخشیں۔ اور جھولے میں سے سگار اور برانڈی کی بوتل نکال کر دونوں کا استعمال شروع کر دیا۔ جبکہ یہ سگار کے لمبے لمبے کشوں کے درمیان برانڈی کی بوتل میں سے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے میں مصروف تھے، بدل کے واسطے سوائے اس کے چارہ ہی کیا تھا کہ وہ چکی کے پاٹ جیسے ہاتھی کے پیروں کے نشانوں کو کچھ دیر حسرت سے دیکھنے کے بعد ایک دوسرے کو، اور دوسرے سے تیسرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کا خیال ہرگز زیادہ دور جانے کا نہ تھا۔ محض شغلِ بیکاری۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چل دیا تھا۔ یہ نشان قریب پچاس گز گھاس سے جنگل کے اندر جانے کے بعد پھر گھوم کر ندی کے کنارے کے متوازی ہو گئے تھے۔ بدل انھیں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ وہ دور نکل آیا ہے۔ واپس جانا چاہئے اس لئے اس کے نشانوں کو چھوڑ کر ندی کے کنارے کی طرف رخ کیا۔ جھاڑیوں اور پتوں کا گھن بیلا کا تھا مگر یہ جھکتا اور بیٹھے بیٹھے کھسکتا، ان کے نیچے نیچے سے نکلتا پھر ندی کے کنارے نکل آیا۔ لیکن جیسے ہی ریتیلے اور قدرے کشادہ کنارے آیا، اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہاں بالکل ہی تازے ہاتھی کی واپسی کے پیروں کے نشان تھے۔ گویا ہاتھی اسی وقت اس راستہ سے صاحب کی طرف گیا ہے۔ بدل نے اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سو گز صاحب سے دور ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی ۴۰/۳۲ مارٹینی اکشن ونچسٹر رائفل کا لیور نیچے کھینچ کر مزید اطمینان کیا کہ کارتوس نال میں ہے۔ اور پھر لیور چڑھا کر رائفل دونوں ہاتھوں میں تھامے واپس بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے جیسے ہی وہ بیت کی ایک جھاڑی کی آڑ سے نکلا، سامنے صاحب ایک ہاتھ میں بوتل دوسرے ہاتھ میں سگار لئے، آنکھیں بند کئے منہ سے دھواں نکالتے نظر آئے۔ اور ساتھ ہی اپنے اور صاحب کے درمیان جنگل کی آڑ میں ان کی

طرف بڑھتا ہوا ہاتھی بھی دکھائی دیا۔
مکار ہاتھی بیجز شکاری کی طرح چھپا ہوا دبے قدم بڑھ رہا تھا۔ اب چند ہی قدم اور آگے بڑھنے کی دیر تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ بدل نے ایک بھیانک چیخ مار کر صاحب کو ہوشیار کیا۔ کانا ہاتھی اس آواز پر بجلی کی سرعت کے ساتھ گھوما اور اس چلانے والے نئے دشمن پر جھپٹا۔ اب بدل کے واسطے سوائے مقابلہ کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا "مارو صاحب مارو!" کہتے ہوئے اس نے بندوق کندھے پر چھوا ئی۔ دھڑ سے فیر کیا۔ فوراً پھر نیچے کی مٹھی میں پانچ کارتوس اور تھے۔ بندوق بھری اور پھر فیر کیا۔ پھر بھری اور پھر فیر کیا۔ ہاتھی کی چھ انچ موٹی ماتھے کی ہڈی پر یہ گولیاں ٹھس ٹھس پڑتی اور پھسلتی چلی جا رہی تھیں۔ تاہم ہاتھی اس تکلیف دہ مذاق سے گھبرا کر رک گیا۔ لیکن اب بدل کا آخری کارتوس خالی ہو کر نال سے گر چکا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر اس طرف دیکھا جہاں صاحب بہادر کھڑے تھے۔ پھر اس نے مڑ کر گھاس کے کنارے کی طرف دیکھا جس میں صاحب بہادر گھس کر غائب ہوتے ہوئے اسے دکھائی دیئے۔ اور اس کے بعد اس نے پھر کچھ نہ دیکھا۔ ہاتھی کے ایک ہی ٹکّے میں یہ گرا اور تین فٹ موٹے پیر کی ایک ہی داب میں کچل کر جیتے جاگتے نوجوان انسان سے ہڈیوں، گوشت اور چیچھڑوں کا مٹی ملواں ڈھیر ہو گیا۔ جس کو ٹھکرا ٹھکرا کر اور نوچ نوچ کر ہاتھی نے اور بھی زیادہ ناقابلِ تصوّر شیرازوں میں بکھیر دیا۔

میجر بوسٹ کا دوسرا ساتھی ان سے پہلے ہی رفوچکر ہو گیا تھا۔ تنہا صاحب بہادر جن مصیبتوں سے مالا کی کوٹھی تک واپس آئے ہیں بس ان ہی کا دل جانتا ہے۔ تاہم خوش تھے کہ جان بچی، اور لاکھوں پائے۔ کارتوسوں کا جھولا اور دونوں میں سے ایک رائفل وہیں رہ گیا تھا۔ جھولے کا تو خیر کچھ

نہیں۔ لیکن جوڑی کے رائفل قیمتی تھے۔ جو چھوڑ آئے تھے۔ اس کی فکر تھی اس لئے دوسرے دن محکمہ جنگلات کو بدل کے دونوں ۳۲/۴۰ اور ۳۵۰ بور رائفل لیکر فرار ہو جانے کی یا گم ہو جانے کی باقاعدہ اطلاع دیکر صاحب بہادر اینٹھتے، اکڑتے، اچھتے چلاتے بریلی روانہ ہو گئے۔

ان کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد بدل کا بوڑھا باپ کلوا پاسی، بلم کندھے پر رکھے، پریشان گھبرایا ہوا کوٹھی پر آیا۔ اور بڑی دیر تک سونی کوٹھی کو دیکھتا رہا۔ آج یہاں چوکیدار بھی نہ تھا جس سے وہ کچھ دریافت کرتا۔ آخر ایک لمبی سانس لیکر وہ پھر واپس لوٹ پڑا اور سیدھا جنگل کی طرف چل دیا۔

صبح دس بجے سے آہیں بھرتا سر نیچا کئے پھرتے پھرتے آخر شام کے پانچ بجے ٹھیک اس جگہ پہونچ گیا جہاں یہ لوگ ہاتھی کے پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ مالاندی کی گھانس میں گھسے تھے۔ جیسے ہی اس نے کالے ہاتھی کے پیروں کے نشان دیکھے اور ان ہی کے برابر فوجی فل بوٹ اور بدل کے نالدار چمڑودھی جوتے کے نشان بھی پائے یہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور " ہائے بھگوان جو کا ہو بھگوان " ہاتھوں میں سر ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر یکبارگی " بدل، بدل۔ ارے لل لہ آت ہوں " کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اور نہایت تیزی سے گھانس میں روانہ ہو گیا۔ گزوں اونچی گھانس میں سرنگ ایسا بے ترتیب راستہ کچلی ہوئی گھانس، کیچڑ اور دلدل میں بنا تھا۔ جہاں بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی کلوا اسی پر آنکھیں گاڑے چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ میجر بوسٹ کی واپسی کا نشان اسے نظر آ گیا تو اس وقت باپ کی محبت نے عقل کو خبط کر دیا۔ اس نے بے اختیار آواز لگائی " بدل رے بدل آت ہوں لل لہ " سنسناتی ہوئی گھانس میں آواز بھرائی۔ اور پھر خاموشی ہو گئی۔

اب کلوا مجنونانہ وار اس گھانس کی اندھیری گلی میں بھاگنے لگا۔ یہاں

تک کہ گھاس ختم ہو گئی ۔ وہ جنگل کے کنارے پر پہونچا ۔ اور اندر داخل ہونے ہی کو تھا کہ دفعتاً بائیں ہاتھ کے نشانوں کی طرف گھوم پڑا ۔ دس قدم اور گیا ہوگا کہ ششدر کھڑا ہو گیا ۔

سامنے ہاتھی کے پیروں کی کھوندن تھی ۔ جا بجا سوکھے ہوئے خون کے سیاہ دھبے اور چھیکے تھے ۔ انسانی جسم کے کئی ایک روندے کھوندے مٹی میں لت پت مکھیاں بھنکتے بدبو دار ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے ۔ بندوق کی ایک پتلی نال خم کھائی ہاتھی کے پیر کے گڑھے میں دھنسی پڑی تھی ۔ اس سے کچھ دُور چمڑو دے جوتے کے پاس ہی بندوق کا کُندا ٹوٹا پڑا تھا ۔

اس نظارے نے کلوا پاسی کو باپ کی حیثیت سے ہٹا کر ایک دفعہ پھر پرانے تجربہ کار شکاری میں تبدیل کر دیا ۔ جوان بیٹے کی موت کا تعلق سرِ دست ملتوی ہو کر موت کے واقعات کی جستجو میں سارا دھیان لگ گیا اس نے آہستہ آہستہ نہایت غور سے ایک ایک نشان کو اور ایک ایک گری پڑی چیز کو دیکھنا شروع کیا ۔ پانچ عدد ۴۰/۳۲ بور کے پیتل کے خالی کارتوس ۔ خون کے سب سے بڑے دھبے کے قریب سے ایک ایک کر کے بینے ، پھر رائفل کی زمین میں دھنسی ہوئی ٹیڑھی نال کو نکالا ۔ مٹی چھڑائی ۔ نال میں دیکھا تو چلا ہوا ایک کارتوس اب بھی موجود تھا ۔ اس نے ایک پکے شکاری کی طرح داد دی ” شاباس ، شاباس ۔ بھاگا نہیں ، ڈٹا رہا ۔ گولی ختم ہوئے گئیں تے بھی ڈٹا رہا ۔“ اسی طرح بڑبڑاتا ہاتھی کے پیروں پیروں چلا ۔ اس جگہ پہونچا جہاں پر سے ہاتھی صاحب کو چھوڑ بدل کی طرف گھوما تھا ۔ یہاں اس نے یہ دیکھا کہ ہاتھی اپنے بائیں طرف جب بدل کے رُخ میں گھما تھا تو ٹھیک بدل کی ہی سمت نہیں گھوما تھا بلکہ کچھ زیادہ گھوم گیا تھا ۔ اور پھر کچھ اُلٹا گھوم کر قدرے سیدھا رُخ کر کے لیکن اب بھی کچھ دایاں رُخ لئے ہوئے بڑھا تھا ۔ کلوا بڑبڑایا ” اُلٹی آنکھ تا ہے ، سیدھی ہی سے دیکھت ہے ۔“ اب اس

کو یہ جستجو ہوئی کہ ہاتھی ادھر کہاں جا رہا تھا۔ اس نے تلاش کی تو صاحب کا جھولا درخت سے لگا دونالا رائفل بھی مل گیا۔ پھر صاحب کے پیروں کے نشان ملے۔ وہیں پر منہ سے گرا ہوا سگار اور ہاتھ سے گری ہوئی برانڈی کی بوتل ملی، رائفل کو کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ دونوں نالوں میں کارتوس تھے جھولے کا معائنہ کیا، اس میں شکاری چاقو، دو چار شیشیاں، سگریٹ کا بند ڈبہ اور ایسی ہی بہت سی چیزیں تھیں۔ لیکن اس نے ان کی کچھ فکر نہ کی۔ اس نے کارتوس گنے اور مزید احتیاط کیلئے نئے کارتوس رائفل میں بھر دیئے۔
اتنے عرصے میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔ کلوا اسی درخت سے پیٹھ لگا کر اس کی جڑ پر بیٹھ گیا۔ اور پھر لڑکے کی موت کے وقوعات پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ پر ہاتھ سجھائی دینا مشکل ہو گیا۔ درخت کے پتوں سے اوس ٹپکنے لگی۔ اور دور مالانڈی کے باہر جنگلوں میں سے چیتلوں کے کوکنے اور گوندوں کے ڈونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

صبح پو پھٹتے ہی کلوا رائفل اور جھولا لیکر ہاتھی کے پیروں پیروں تیز روانہ ہو گیا۔ اور شام تک برابر ایسے ہی چلتا رہا۔ دن میں دو ایک دفعہ گڑھوں اور نالوں کے قریب سے گزرا تو پانی پینے کو ضرور رکا۔ ورنہ ایک منٹ بھی کہیں نہ ٹھیرا۔ ہاتھی نے مالانڈی کے اس ٹاپو میں سے دوسرے کنارے کا رُخ کیا تھا۔ وہاں سے جنگل ہی جنگل شمال کی طرف چلا گیا۔ شام ہوتے ہی کلوا نے پھر نشانوں کو جھک کر دیکھا۔ گوبر کو چٹکی سے مسلا۔ اور مایوسی کی حالت میں سر ہلایا۔ ہاتھی اس سے پورے چوبیس گھنٹے پہلے کا چلا ہوا تھا۔ اب بھی یہ نشان کافی باسی تھے۔ اور اب رات ہو رہی تھی۔ یعنی کلوا کو اپنا تعاقب موقوف کرکے رات گذارنا تھی۔ اور رات ہی ہاتھی کو پھر کسی اور طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس طرح رات بھر میں پھر ان دونوں

کے درمیان فاصلہ بڑھ جانے کا یقین تھا۔ لیکن کلوا کر ہی کیا سکتا تھا مجبوراً ایک درخت پر چڑھ کر رات بسر کی۔ دن بھر کا بھوکا اور تھکا ہوا تھا۔ ایک غنودگی کی حالت ان پر طاری ہو گئی۔ اور اسی طرح صبح ہو گئی۔ صبح یہ پھر روانہ ہوا۔ اب اس کو نہ جنگل کے ٹکڑوں کا دھیان رہا۔ نہ سمت کا خیال رہا۔ نہ اس کا بھی اندازہ رہا کہ کس قدر فاصلہ وہ چل چکا ہے۔ تھکن اور بھوک پیروں کو ڈگمگا رہے تھے۔ اور تعاقب کا جنون سر پر سوار تھا۔ انتقام کی آگ دل میں لگی تھی۔ ارادے کی قوت تھی جو آگے بڑھا رہی تھی۔

دن کے ایک بجے کے قریب اس نے جھک کر ایک جگہ گوبر مسلا۔ اندر سے نرم اور تر تھا۔ کلوا کو یقین ہو گیا ضرور صبح کا گوبر ہے۔ اسے خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ ہاتھی قریب ہی میں کہیں رکا ہوا دن گذار رہا ہے۔ اس امید کے پیدا ہوتے ہی کلوا اور تیزی سے روانہ ہوا۔ اب یہ کسی نالے گھنے کلک میں سے گذر رہا تھا۔ جہاں اکثر اسے چاروں ہاتھ پیروں پر ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ کیونکہ اس کلک میں کھیر کے چھوٹے چھوٹے کانٹے دار پودے مخلوط تھے۔ اب جوں جوں کلوا آگے بڑھے کیچڑ اور دلدل زیادہ ہوتی جائے۔ ان سب باتوں سے اسے یقین ہو گیا کہ بس اس کے آگے ہی کہیں ہاتھی نے دن گذارا ہے۔ اور شام ہوتے تک وہیں رہے گا۔ اب اس کے واسطے صرف یہی تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے یہ اُس تک پہونچ جائے، ورنہ شام ہو گئی تو ہاتھی رات میں کہیں اور نکل جائیگا۔ کلک کے ختم پر بیت کی جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ یہ اور بھی زیادہ گھنی اور کانٹوں دار تھیں۔ ان میں سے تو اسے اوندھے لیٹ لیٹ کر آگے کھسکنے کی ضرورت پڑنے لگی۔ ایک جگہ ایسے ہی لیٹے لیٹے کھسک کر جھاڑی میں سے نکلا تو دیکھا کہ سامنے ہاتھی نے اپنا راستہ خود کاٹا ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ راستہ کاٹنے کے نشان پر کچھ دور چلا کہ پھر گوبر ملا۔ اب جو اُسے چھوا تو بالکل تازہ گرم گرم۔ اب اس نے پیروں کے نشانوں کے بائیں طرف

چلنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ہاتھی بائیں آنکھ سے ہی کانا تھا۔ جوں جوں یہ آگے بڑھتا گیا پیروں کے نشانوں سے اور زیادہ ہٹ کر چلنے لگا جنگل کے گھن کی وجہ سے بار بار اس کو پھر سیدھے ہاتھی کی طرف نشانوں کے قریب آ کر اُن کا رُخ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس وقت کلوا کی یہ حالت تھی کہ خفیف سے خفیف آواز پر اس کے کان لگے ہوئے تھے۔ نگاہیں دائیں بائیں ہر طرف ایکساں چل رہی تھیں۔ دونوں مٹھیوں میں دو دو زائد کارتوس اور بھرا ہوا رائفل سامنے اُٹھائے چوکنا، جھاڑیوں کو کتراتا ڈھونڈھتا پھر رہا تھا۔ اسی حالت میں ایک دفعہ پھر جب وہ پیروں کے نشانوں کی طرف آ رہا تھا تو اسے ڈالیوں کے چرچرانے کی آواز سُنائی دی۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑھا، یہانتک کہ وہ اپنے سے بیس قدم دُور کھڑے ہوئے ہاتھی کے پاس آ گیا۔ ہاتھی ترچھا کھڑا ایک درخت کی ڈالیاں توڑ رہا تھا۔ کلوا نے دو فیر تڑا تڑ اس کی کنپٹی پر کئے۔ جن سے کہ ہاتھی گھبرا کر بھاگ پڑا۔ اب کلوا نے شور مچاتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد اس شور کی وجہ سے ہاتھی کلوا کی طرف گھوم پڑا۔ کلوا ہاتھی کے سامنے ساکت کھڑا ہو گیا۔ اور جیسے ہی ہاتھی اس پر جھپٹا، یہ پھر اس کے بائیں طرف پھرتی کے ساتھ ہٹ گیا۔ اور نیزے بھر کے فاصلہ سے پے در پے دو گولیاں پھر اسی کنپٹی پر رسید کیں، جن سے کہ ہاتھی گھٹنوں کے بَل جُھکا اور پھر دھماکے کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ گرے ہوئے ہاتھی پر کلوا نے دو گولیاں اور جمائیں۔ اور اس کے ساتھ ہی خود بھی بندوق کا سہارا لیتے لیتے جُھکتا چلا گیا۔ اور بیدم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اب ہاتھ پیر جواب دے چکے تھے۔ لیکن انتقام کی آگ اب بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پھر پڑے پڑے بندوق کو کھولا۔ خالی کارتوس نکالے اور جھولا گھسیٹا۔ وہ پھر کارتوس بھر کر اور فیر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بندوق ہاتھوں سے گر گئی۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔

لیکن دوسرے دن صبح دس بجے امیر احمد فارسٹ گارڈ مع دو چوکیداروں

کے جب اس طرف آئے تو کلو آپاسی ہاتھی کے پیٹ پر بیٹھے ہوئے سر پکڑے رو رہے تھے ۔ قانوناً ان کو گرفتار کیا گیا ۔ اور اسلحہ ناجائز کے استعمال کا مقدمہ اُن پر چلایا گیا ۔ اور ساتھ ہی پانچسو روپیئے کے انعام کے مستحق ہونے کی بھی اطلاع دی گئی ۔ اور ان سب کارروائیوں کے سلسلہ میں ایک دن میجر بوسٹ کو بھی بہ سرِ عدالت سر جھکا کر اپنے شکار کے تمام واقعات صحیح صحیح دوہرانا پڑے ۔ اپنے بیان میں جہاں کہیں میجر بوسٹ اڑنے کو ہوتے تھے تو فوراً ڈپٹی کمشنر یعنی لیوئس کا باپ ان کو وہیں روک دیتا تھا ۔ اور پھر کلو آپاسی سے اس کی تحقیقات کے مطابق سوال کرتا تھا ۔ کیونکہ لیوئس کی خوشی تھی کہ میجر بوسٹ سے خود اُن کی بزدلی کا اقرار کرایا جائے ۔ جس کے سُننے کے واسطے وہ خود بھی عدالت میں موجود تھی ۔

شیریں فرہاد

اگر میں یا آپ میں سے کوئی ہوتا تو ضرور رقت آمیز سُروں میں یہی مصرع بار بار دوہراتا ۔ ع

سرِ بام آئیے ہم طالب دیدار بیٹھے ہیں

لیکن اندھیری سُنسان گلی میں فرہاد تھوڑی دیر بعد دبی ہوئی آواز میں، عجب منّت آمیز لہجے میں کھینچ کھینچ کے "آؤ، آؤ" ہی کہہ کے شیریں کو بُلاتے رہے ۔ اور شیریں کے سرِ بام نمودار ہونے میں جو جو دیر ہوتی گئی اُن کی "آؤ" میں درد کے سُر بڑھتے گئے یہانتک کہ "آؤ" سے "عاؤ" ہوا اور عاؤ سے "عاعو" ہوگیا ۔ جب جل کے کہیں شیریں صاحبہ لچکتی دبکتی، ٹہلتی ٹہلتی کوٹھے پر آئیں ۔ اور بڑے ناز و انداز سے سمٹ سمٹا کر چھجے پر بیٹھ کر نیچے گلی میں کھڑے ہوئے فرہاد کو دیکھنے لگیں ۔

فرہاد نے آہ سرد بھر کر کہا "عا، عو!"

شیریں نے لاپرواہی سے جواب دیا "میاں آؤ"

میاں تو عہد کرچکے تھے کہ گھر میں قدم نہ رکھیں گے ۔ اُس دن ریکٹ ایسا پڑا تھا کہ کمر میں آج تک درد تھا ۔ اس لئے وہ اصرار کے ساتھ شیریں کو ہی گلی میں

بلاتے رہے۔ لیکن شیریں کو کیا غرض تھی کہ وہ جاتی۔ تھوڑی دیر بیٹھی اُن کی غاعو۔غاعو سُنتی رہی۔ اور پھر ایک بار اور "میاں آؤ" کہتی ہوئی اٹھی اور آہستہ سے کوٹھے پر سے غائب ہوگئی۔

اب کہاں صبر ہو سکتا تھا۔ کیسا عہد اور کس کا ڈر۔ اُچک پڑوسی کی ڈیوڑھی پر اور وہاں سے پھلانگ چھت پر آ گئے۔ مگر سنگدل شیریں کوٹھے پر سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ مجبوراً اب یہ صحن کی طرف دبے پاؤں بڑھے۔ آہستہ سے چھجے پر آئے، گردن بڑھا کر نیچے صحن میں دیکھا۔ کس قدر دلچسپ سین تھا۔ چاروں پیر جوڑ، دُم کو سمیٹ کر پیٹ سے ملا، دبک کر خاموش ہو گئے۔

صاف سُتھرے مختصر صحن کو بجلی کے دو قمقموں نے روشن کر رکھا تھا۔ اور تیسرا لیمپ مچھر دانیوں سے ڈھکی ہوئی پاس پاس بچھی دو مسہریوں کے سرہانے جل رہا تھا۔ اسی کے برابر بجلی کا پنکھا (جس سے فرہاد کو سخت نفرت تھی) جھلل جھلل کرتا چمکتا گھوم رہا تھا۔ کچھ فاصلہ دیکر تختوں کا چوکا تھا۔ جس پر سفید چاندنی بچھی تھی۔ چاندنی پر بسنتی زمین، گلابی پھول اور نیلے حاشیہ کا قالین بچھا تھا۔ اس پر گاؤ تکیہ، ایک طرف اُگالدان، دوسری طرف تانبے کا قلعی دار پٹاری نما پاندان اور ڈلی کی ٹوکری۔ تختوں کے برابر ایک چوکی پر سوندھے سوندھے دو نئے گھڑے، ایک جھجری اور ایک صراحی، دونوں کے گلوں میں موتیا کے ہار لپٹے تھے۔ لوٹے، صابن دانی، بیسن دانی سب نئے جھلملاتے ہوئے

دوسری چوکی پر نعمت خانہ (جو کہ کُھلا ہوا تھا) اس کے برابر میں چھوٹی سی انگیٹھی پر دودھ کی دیگچی جس پر موٹی بالائی آ چکی تھی۔

صحن کے دوسری طرف باورچی خانہ کی صحنچی کے پاس مُرغیوں کا دڑبہ تھا۔ باورچی خانہ میں سے شامی کبابوں کے واسطے اُبلے ہوئے قیمہ کی بُو آ رہی تھی۔ اور دڑبے میں سے رُک رُک کر مُرغیوں کی کُھس پُھس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فرہاد نے بڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ اس خاموش منظر کو دیکھا۔ آخر اُن کو

یقین ہی ہوگیا کہ گھر میں انسان کوئی نہیں ہے۔ اور اگر ان سفید سفید کپڑے کی کوٹھڑیوں میں کوئی ہے بھی تو ضرور سو رہا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اب اور جرأت کی، اُٹھے اور منڈیر منڈیر باورچی خانہ کی طرف چلے۔ مچھر دانی کے اندر اقبال دلہن کے پاس لیٹی ہوئی شیریں نے ان کو دیکھ لیا۔ پنجوں پنجوں مچھر دانی کھسکا سٹ مسہری سے نیچے کود گئیں ٹہلنے۔ کوٹھے پر سے فرہاد نے اُن کو جو دیکھا خورش کا خیال ترک کر جذباتِ عالیہ کی طرف رجوع ہوئے۔ عجب سوز و گداز تھا۔ فرمایا "عاعو"

اُن دو میں سے ایک سفید حجرہ ہلا۔ اور ساتھ ہی زوردار آواز آئی "وہ دیکھو وہ دیکھو! وہ آگئے آپ کے فرہاد"

دوسرے سُفید حجرے میں سے مہین لوچیلی آواز آئی "یہ نہ کہیئے! یہ نہ کہیئے کہ آپ کے فرہاد، فرہاد ہو گا تو اس چڑیل شیریں کا، میرا کیوں ہونے لگا"

"تو تمہارا فرہاد کون ہے؟"

"میرا کوئی بھی نہیں ... اور ... اور ... سوائے آپ .. اور ..."

"کہو، کہو۔ چُپ کیوں ہوگئیں؟"

"کبھئی ہو گا۔ میں نے تو ابھی ابھی پیروں میں مہندی لگائی ہے۔ کچھ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ اللہ آپ ہی اُٹھ کر نعمت خانہ بند کر دیں"

سُفید حجرے میں حرکت ہوئی۔ لرزا، کانپا اور شق سا ہوا۔ فرہاد صحن کی طرف سے گلی کی طرف نکل گئے۔ اور اقبال احمد صاحب الیکٹرک سپلائی کمپنی کے نوجوان، کلین شیو، شفٹ انجنیر صاحب، سُنہری عینک لگائے، ساقی کا شمارہ ہاتھ میں لئے، سیاہ دھاریوں کا نائٹ سوٹ پہنے نمودار ہوئے۔ نعمت خانہ کے پاس پہنچے تو اُن کی تین ماہ کی بیاہی ہوئی بیگم یا دلہن نے لوچ، منت، غرور محبت اور شرم پانچوں حربوں کو ادا کرنے والے ایک عجیب لہجے میں کہا "کبابوں کے واسطے اُبلا ہوا قیمہ بھی تو ہے۔ آپ بیٹھے رہیں بھئی ذرا اور بڑھ جایئے اُس کی

پتیلی بھی اُٹھا لائیے۔ اور یہ دودھ بھی سب نعمت خانہ میں رکھ دیں۔"
اقبال احمد بغیر ایک لفظ بولے آہستہ سے باورچی خانہ کی طرف مُڑے، اندر گئے۔ جسم سے دُور چٹکی میں لٹکائے ہوئے دھوئیں سے کالی پتیلی لائے، اس کو اندر رکھا۔ پھر دودھ کی پتیلی رکھی۔ نعمت خانہ بند کیا۔ اب چلے ہی تھے کہ پھر آواز آئی۔
"رحیمن شام ہی گھر چلی جاتی ہیں۔ کتنا ہی کہو کہ اے بُوا ذرا رُک جاؤ، مگر وہ کب سنتی ہیں۔ نہ معلوم دڑبہ بند کیا کہ نہیں۔ بھئی اس کو بھی دیکھ لیجیے۔"
اقبال احمد نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی مسہری سے دڑبہ کا رُخ کیا۔
"آخر شوق میں شوق یہ بلّی پالنے کا کیا شوق ہے۔ یہی حرامزادی تمہاری شیریں شہر بھر کے بلّے بلا کر لائے گی۔ ابھی تو ایک ہی فرہاد آئے ہیں۔ دیکھو تو درجنوں آئیں گے۔"
شیریں اپنی جنس کی فطرت کے مطابق محلّہ کے حلوائی کے کبڑے بلّے کو اپنی دوچار ادائیں دکھا کر پھر اقبال دولھن کے پاس گھس آئی تھیں۔ دولھن نے اپنا حنائی ہاتھ بلّی کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا "کیوں ری شیریں! تیرا ایسا ہوائی دیدہ ہوا ہے۔"
شیریں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور خُرخُر کرتے ہوئے سر کو اوپر اٹھا کر دولھن کے ہاتھ سے رگڑتی ہوئی چلیں تو دُم کی نوک تک چلی آئیں۔
لیکن اقبال احمد مُرغیوں کے دڑبے سے واپس لوٹے تو اپنی مسہری پر نہ آئے بلکہ دالان کی طرف بڑھے تو فوراً نسیمہ (دولھن) نے چونک کر کہا "اب کہاں چلے۔ اے کہاں جا رہے ہیں بولئے تو۔"
"فرہاد کی دعوت کا سامان کرنے۔"
"بھئی خدا کے لئے نہیں۔ آپ کو ہماری جان کی قسم کچھ نہ کہئے گا۔ بلّی کو نہیں مارنا چاہیئے۔ سُنا نہیں بلّی کو مارو تو روئی کے گالے سے مارو۔ واہ آپ تو خوب

ہیں۔ اس روز مُوئے کے تھاپی اس زور سے ماری۔ مجھے وہم آتا ہے۔ بھئی کیا کر رہے ہیں۔ آخر ارادہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، دعوت کرنے کا ارادہ ہے۔ تھوڑی بالائی کھلاؤں گا فرہاد صاحب کو۔"

یہ کہتے ہوئے اقبال احمد کمرے میں غائب ہو گئے۔ اور وہاں سے چھوٹی میز، ایک مُرادآبادی بڑی سی تھالی اور بجلی کے تار کی ایک لچھی لئے ہوئے آئے میز پر تھالی رکھی۔ تھالی کے بیچوں بیچ میں طشتری میں تھوڑی سی بالائی اور دودھ رکھا۔ پھر بجلی کا ایک تار ننگا کر کے تھالی کے نیچے دبا دیا۔ اور دوسرا چینی کی طشتری میں دودھ میں ڈال دیا، اور جب یہ سب ہو گیا تو پلگ لگا دیا۔

"اوئی اللہ، اس وقت تو شیریں تم وبالِ جان ہو گئیں۔ ایکساں جائیں مائیں، جائیں مائیں گھُسی چلی آرہی ہیں۔ اے رحیمن، اے رحیمن بُوا، تم تو کوٹھڑی میں جاتی ہو تو بیٹھ جاتی ہو۔ اے چلو آؤ۔ لاؤ گھی، بس بس دو ہی ٹکڑوں بھر کا اور چاہیئے ہے۔ لاؤ چلے جاتے ہیں۔ عیدو میرا بھیا جلدی سے دھولا۔"

کنکٹاتے جاڑے، شام کا وقت، منٹوں میں تو رات ہوتی ہے۔ میاں نے پانچ بجے کا وقت پارٹی کا بتایا تھا۔ نسیمہ نے جلدی جلدی سب طرح کا پکوان، شاخیں، سوہال، کھجوریں، نمک پارے، خستہ کچوریاں، آلو، قیمہ، پوریاں، تلے انڈے سب تیار کر لئے تھے۔ نان پاؤ کے ٹکڑے تل رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہتی تھی۔ آج ضرور میاں ان سب کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ کہ سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔ "آئی میاں" کہتی ہوئی رحیمن دوڑی۔ نسیمہ نے دوپٹے کے آنچل سے چولھے میں سے اڑی ہوئی مُنہ پر کی راکھ پونچھی۔ مسٹر اقبال احمد چوخا کی دار اونی ہوز، خاکی نیکر، نیلا بلیزر پہنے، گلے میں چھ انچ لمبی، تین انچ چوڑی بو لگائے، سر پر بانکا فاختئی مُرغی کے پَر سے آراستہ فلٹ کیپ اوڑھے گھر میں داخل

ہوئے۔ ہاتھ کا پلندہ تخت پر رکھا۔ ڈورے نوچے، کاغذ پھاڑا۔ اس میں سے چار ڈبے نکلے۔ مکھن کا ڈبہ، رس بھری جام کا ڈبہ، پنیر کا ڈبہ اور 555 سگریٹ کا ڈبہ، جیب سے چاقو نکال انہی کے کھولنے میں مشغول ہو گئے۔ اور جب سب سے ضدی مکھن کا ڈبہ بھی بہزار خرابی کھل گیا تو بیوی کو آواز دی۔

"کیوں بھئی اب نکلو گی بھی کہ نہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک تمہارے پکوان ہیں سے کچھ بھی تیار نہیں ہوا۔ میں تو سمجھتا ہی تھا"

"جی نہیں، سب ہو گیا۔ سب تیار ہے۔ اے لیجئے میں ابھی آئی" یہ کہتی ہوئی نسیمہ باورچی خانہ سے ایک پیر کی پھٹی ہوئی چپل گھسیٹتی ہوئی نکلی۔

"آخر نئی چپل کس دن کے واسطے اُٹھا رکھی ہے، خیر ہوگا، تم سے تو کہنا فضول ہے۔ لاؤ ڈبل روٹی لاؤ۔ جلدی لاؤ۔ سینڈوچز بناؤں۔ دُنیا کی بیویاں یہ کام کیا کرتی ہیں۔ یہاں ہم خود کرتے ہیں۔ بیوی ہماری کچھ جانتی ہی نہیں۔ کیا بتاؤں، ایبٹ آباد میں ان چیزوں کے لینے میں دیر ہو گئی۔ اے بھئی لاؤ۔ کھڑی کیا سُن رہی ہو۔ لاؤ ڈبل روٹی، انڈے اور انگیٹھی بھی"

نسیمہ کی صورت افسردگی، گھبراہٹ، پریشانی، خوف، مری ہوئی آواز میں پوچھا "نان پاؤ۔ نان پاؤ؟"

"ہاں ہاں نان پاؤ۔ ارے ڈبل روٹی کہو نا۔ ہائے افسوس۔ مر گئے نان پاؤ کے کھانے والے اور مر گئے نان پاؤ کے پکانے والے۔ لیکن ہماری بیوی آج بھی نان پاؤ ہی کہتی ہیں۔ ریکٹ مُنہ سے نہ نکلا۔ جب کہا تھا پی۔ اچھا ڈبل روٹی نہ سہی نان پاؤ سہی، وہ ہے کہاں؟"

"مجھ سے بھول ہو گئی"

"اچھا کوئی نیا شگوفہ کھلا ہے۔ ہاں بھی کیا بھول ہو گئی؟"

"میری عقل پر پتھر پڑ گئے"

"ارے کچھ کھل کر کہو تو سہی"

"اب آپ جو جی چاہے کہئے۔ بیشک مجھ سے قصور ہو گیا۔ کل آپ نے کچھ کہا تو تھا میں نہ معلوم کیا سمجھی۔ میں نے تو نان پا... ڈبل روٹی کے میٹھے ٹکڑے پکا دیئے۔"

اقبال احمد کے ہاتھ کی کہنی تخت پر ٹک گئی۔ سر ہاتھ کی ہتیلی پر ٹک گیا۔ مری ہوئی آواز میں۔ "اچھا وہ انڈے!"

نسیمہ کی کچھ جان میں جان آئی۔ کچھ کھلی آواز میں اطمینان کے لہجہ میں بولی۔ "وہ تو تیار ہیں۔ سب تلے رکھے ہیں۔"

"ہائیں! افسوس، افسوس! ایملٹ بھی ختم۔ ہائے ری قسمت۔"

نسیمہ کے منہ پر اب ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ خاموش سُنتی رہی۔

"ارے میں تو سمجھتا ہی تھا کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ پارٹی کیا ہوگی اور سُبکی ہوگی۔ کیا کرتا سب سر ہو گئے۔ ترقی ہوئی ہے پارٹی دو۔ پارٹی دو۔ اسسٹنٹ انجنیر ہو گئے ہو۔ اس روز رابرٹسن نے پارٹی کی کیسی .... خیر اس کو جانے دو۔ مقبول نے پارٹی دی۔ کس قدر اس کی بیوی سلیقہ مند ہے۔ کیک بھی گھر کے ہی بنے ہوئے تھے۔ اچھا جو میں کل کیک لایا تھا وہ تو ہیں یا انھیں بھی کچھ کر ڈالا؟"

نسیمہ نے کیک لا کے دیئے۔ عیدو کو آہستہ سے بُلایا۔ اپنا پکایا ہوا سامان پلیٹوں میں لگا لگا کر رکھا۔ اقبال احمد نے عیدو کو ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے کمرے میں میز پر سب سامان لگایا۔ اور ہر ہر طرح عیدو کو سب سمجھا دیا کہ یوں چائے لانا۔ یہاں کھڑا رہنا۔ اس طرح سے برتن رکھنا اور اُٹھانا۔ غرضکہ نیا چھوکرا اور ہندوستانی ناشتہ۔ قہر درویش برجان درویش۔ سب تیار کر ہی چکے تھے ہنستے ٹھٹے لگاتے چاروں دوست، جن کو مدعو کیا تھا سائیکلوں پر آگئے۔

خدا کا شکر ہے کہ پارٹی ہر طرح سے کامیاب رہی۔ رابرٹسن نے دہی بڑے بہت ہی مزے لے لے کر کھائے۔ اور کہا کہ ہماری میم صاحب کو بھی ایسا پکانا

آجائے تو اچھا ہے۔ آپکی بیگم کھادیں گی؟"

مقبول نے توصاف کہہ دیا "یار یہ اچھا کیا کہ یہ چیزیں تیار کروائیں۔ واللہ لُطف ہی آگیا"

کیک کسی نے چھوئے بھی نہیں۔ اقبال احمد بہت خوش تھے۔ خیر۔ بگڑی بات بن گئی۔ نیا چھوکرا عیدو بالکل جنگلی۔ لیکن خیر وہ بھی خاموش رہا۔ کوئی خاص بدتہذیبی نہ کی۔ ایک دو دفعہ ان لوگوں کی ہنسیوں میں خواہ مخواہ خود بھی شامل ہونے کی شروعات ضرور کی۔ لیکن اقبال نے جونہی گھورا فوراً دانت بند کر لئے۔

ناشتہ بڑے قرینے اور سلیقے سے ختم ہوا۔ اور عین اس وقت جبکہ یہ لوگ میز پر سے اٹھنے ہی کو تھے، آسمان پر سے ایک بلائے ناگہانی پُھنکاریاں بھرتی اور گزوں اُچھلتی ٹپکی کہ اللہ کی پناہ! میز الٹی، برتن ٹوٹے، مہمان بھاگے۔ آپس میں ٹکرائے، کُرسیوں میں اُلجھے اور گرے۔

عیدو صاحب نے تین ہی بجے سے موقع بہ موقع تھوڑی چیزیں چُرا کر تانبے کی بین دانی میں جمع کی تھیں۔ تاکہ رات کو فرصت میں ان کا مزا لیا جائے۔ بین دانی روشندان کے پاس ہی پتّے سے ڈھکی رکھی تھی۔ مقدر کے کھوٹے فرہاد صاحب شیریں کے فراق میں پھرتے پھرتے اس کے پاس آگئے۔ ناک میں بُو کیسے نہ جاتی اور تر مال کی بُو آرہی ہے تو کیسے چھوڑدیں۔ لیکن بین دانی کا منہ تنگ تھا، سر اندر تو چلا گیا مگر باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ اندھے بھینسہ بن گئے۔ آگے پیچھے ہٹتے ہٹتے روشندان میں سے ٹپک پڑے۔ اب جو گرے اور اتنے بہت سے اجنبی آدمیوں کی ایسی ایسی آوازیں سُنیں تو پھر کیا تھا، چاروں پنجوں کے ناخن نکالے، پُھنکاریاں بھرتے زمین سے آسمان کی طرف رجوع ہوتے تھے۔ اور آسمان سے زمین پر گرتے تھے۔ ظالم دو دو گز اچھل رہا تھا۔

ہر طرف تاریکی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ ہلکا ہلکا دھواں محلہ کی چھتوں پر پھیل رہا تھا۔ اُفقِ مغرب پر سورج ڈوب رہا تھا۔ اسکی یادگار گہرے سیاہی مائل بادل کے دو چار ٹکڑے منتشر موجود تھے۔ لیکن ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ سی دور بہت دور بازار کی طرف سُنائی دے رہی تھی۔ پاس ہی کے ایک مکان سے کسی شیر خوار بچے کی ایک سالنس اور ایک سُر میں رونے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ اطراف کی گہرائیوں اور کوٹھے کی دیواروں کی جڑ و میں سیاہی قدم جما چکی تھی۔ شیریں کوٹھے کی لونا گی دیوار پر ساکت اپنے سامنے کی مُتذیر پر نگاہیں جمائے افسُردہ بیٹھی کسی گہرے سوچ میں غلطاں معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سوچ بس افسُردگی ہی تک محدود تھا۔ واقعات کی یاد، ان کا تسلسل حادثات کی وجہ اور اُن سے نتیجہ نکالنا یہ سب باتیں وہ بیچاری کہاں جانتی تھی۔ جب بھی وہ اپنی سہیلی نسیمہ کو رنج اور تکلیف میں دیکھتی تھی تو اس پر بھی رنج کا جانگسل غلبہ چھا جاتا تھا۔ نسیمہ کیوں اور کس لئے جسمانی تکلیف اور روحانی کوفت میں مُبتلا ہے۔ اس سے اس کو کیا سروکار، اس کو گذشتہ کے بھی وہ دونوں واقعات یاد نہ تھے۔ جب پہلے دو دفعہ نسیمہ کے یہاں ستوانسے بچے پیدا ہوئے تھے۔ اور اب یہ تیسری باری تھی۔ وہی ستوانسہ بچہ پیدا ہوا۔ اور نہ صرف خود ہی پیدا ہوتے مر گیا بلکہ ماں کو بھی بُلاوا دیتا گیا۔

پہلوٹھی کی دفعہ زچہ خانہ میکے میں ہوا تھا۔ ماں کے علاوہ خالہ، ممانی اور بھابی سب ہی تیماردار تھے۔ دوسرے کی دفعہ میکے نہ جا سکی، لیکن ماں زندہ تھی۔ گو قسم کھالی تھی کہ ماں کے گھر قدم نہ رکھیں گی۔ لیکن وقت پر پیٹ پکڑے دوڑی چلی آئیں۔ اب کی کون کرتا۔ ماں چل بسیں، خالہ نے انکار کر دیا۔ بھاوج خود پورے دنوں سے ہے سسرال والے نئے پھیرو، نام و نمود کر دیوانے گز بھر او بچے ہوئے تو اتر اگئے۔ نیچے کی دُنیا آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اقبال احمد اسی گوشت پوست کے بنے، ٹھیک اسی ڈھرے پر چل رہے

کہ جیسے ہی سیڑھی اوپر چڑھتے تھے نیچے کی سیڑھی کھود ڈالتے تھے۔ شفٹ انجنیر سے اسسٹنٹ انجنیر ہوئے۔ پرانے دوستوں کو طلاق دی، نئے بڑھیا دوست پیدا کئے۔ اسسٹنٹ سے ریزیڈنٹ انجنیر ہوئے۔ تو ان سے بھی بے تکلفی چھوڑی، پورے سے زیادہ اخلاق برتنا۔ سادگی چھوڑی، کمال ہمدردی اور محبت جتائی، کس خوبصورتی سے ان کو بھی دھتا بتائی۔ اب جو جورو کی طبیعت خراب ہوئی تو کون آیا، مسز جھا، مسز رحمٰن، مس فرحت وغیرہ۔ ایسی پرندیاں لپ اسٹک لگائے، کیمرے، ناولیں، چھتریاں ہاتھوں میں لئے فاشسٹ اور سوشلسٹ مسائل پر گفتگو کرتی، لپ جھپ کرتی، قہقہے لگاتی آئیں۔ چائے پی، چاکولیٹ کھائے، سگریٹ پیئے۔ بیس منٹ، آدھ گھنٹہ ٹھیریں، ہمدردی جتائی، نصیحتیں کیں، معالج بنیں اور چل دیں۔ چلتے چلتے پھر ہمدردانہ نصیحتیں کرتی گئیں۔

"مسٹر اقبال آپ کو چاہئے کہ ضرور آپ ایک نرس کو ہفتے دو ہفتے کی واسطے کرایہ پر رکھ لیں۔ یہ دائی لوگ کیا جانیں مریض کو رکھنا۔ اور مریضہ کو بالکل اٹھنے بیٹھنے نہ دیں۔ آرام کریں، بالکل آرام۔ شور و غل کچھ نہیں۔ آپ بھی ان کے کمرے میں بہت کم جائیں۔ بلکہ بالکل نہ جائیں۔ خاموشی، آرام، بس۔ ۔ ۔ اور، اور۔ ۔ ۔ مکان۔ ۔ ۔ مکان بھی ٹھیک نہیں کیوں نہیں آپ شہر سے باہر کوئی چھوٹا سا مکان لے لیتے۔ بڑے سستے مکان مل جائیں گے۔"

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے شوہر کی نام لیوا مسز ہیل سند یافتہ نرس مبلغ چار روپئے یومیہ پر نسیمہ کی تیمارداری کیلئے دوسرے ہی دن تعینات ہو گئیں۔ اور اس باکمال سحر نواز معالجہ نے اپنی ان تھک کوشش اور توجہ سے بہت جلد لب گور نسیمہ کو قطعی موت کے ہاتھوں سے کھینچ کر طویل عرصہ کیلئے مردہ زندگی بسر کرنے کو چھوڑ دیا۔

اس کو نہ معلوم کب اور کس وقت کمرے میں اندھیرا سا تھا، کچھ ہوش سا آیا۔ افسردہ دل لرزاں تھا، ہاتھوں میں کپکپی تھی۔ سر میں چکر تھا۔ امّاں وہیں تھیں کہ نہیں۔ یاد پر قابو نہ تھا، آنکھیں کھولیں، کسی کو پھرتے دیکھا۔ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ ــــ مسز ہیل گھومیں۔ بیگم کو ہوش میں پایا۔ "او خُدا، او خُدا۔ تیرا شُکر۔ بیگم اب اچھا ہے۔ فکر نہ کرے۔ جلدی ٹھیک ہو جائیگا"

نسیمہ نے ایک جُنبش اور محسوس کی۔ آنکھیں اور کھولیں۔ بینائی نے ترقی کی، ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ دماغ ٹھیرا، یاد اور حافظہ نے ہلّہ بولا۔ عقل کی دستگیری کی، ... مکان ... گھر ... عورت .... میم بلکہ ڈاکٹرنی ... اس کے بازو میں ... مرد ... اپنا مرد .... وہ ... وہ ... وہ .... اللہ شکر، تیرا شکر ... وہ، وہ کیا کر رہے ہیں .... ڈاکٹرنی کو تک رہے ہیں اور اور اس طرح تک رہے ہیں۔ ڈاکٹرنی حسین ہے، وہ ہاں۔ انہی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ اِدھر اب بھی نہیں دیکھا۔ ان کی آواز "مسز ہیل ... انگریزی انگریزی ...."

میم کی آواز "انگریزی انگریزی ... مسز اقبال ...... انگریزی ... انگریزی"

"آنکھیں بند کر کے سنوں"

آنکھیں بند کر لیں اور آوازیں مدّھم اور "ڈولی آئی ہے۔ ڈولی آئی ہے" کی آوازیں تیز ہونے لگیں۔ ہر طرف سے ڈولی آئی ہے، ڈولی اُتروا لو کی آوازیں ہوئیں۔ اور پچاسوں ڈولیاں نسیمہ کے چاروں طرف ناچنے لگیں۔

اندھیری دیوار پر آہستہ سے فرہاد کا سر نمودار ہوا۔ پھر سینہ، پھر پیر بھی اُوپر آئے۔ اور اب فرہاد دیوار دیوار شیریں کی طرف بڑھے۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ انتہائے فلک پر سُرخی کا ایک دھبہ باقی تھا۔ بچّہ اب بھی رو رہا تھا۔

دور کہیں ایک ڈھولک بھی بجنا شروع ہوگئی تھی۔ دو ایک گھریلو چمگادڑ ہوا میں سپاٹے بھر رہے تھے۔ فرہاد "آؤ، آؤ" کرتے شیریں کے قریب آئے۔ لیکن وجہ درد وجہ اسباب جانے شیریں کے حیوانی دیدوں میں دو آنسو تھے۔ وہ دیوار سے کوٹھے پر کودی اور وہاں سے نیچے تیزی سے غائب ہوگئی۔

صدقے، صدقے شیریں، تیری متبرک آنکھوں کے صدقے۔ دُنیا بھر کے سچے موتی تیرے ان دو آنسوؤں پر نثار۔

اور چونکہ اس زمانہ میں شیریں اکثر افسردہ اور غمگین رہتی تھی اس لئے فرہاد کے دل پر بھی بڑا اثر تھا۔ وہ بیچارا اپنی سی ہر کوشش شیریں کا غم غلط کرنے کیلئے کرتا رہتا تھا۔ گلیوں کے چوہے، دیواروں پر کی گلہریاں یا کسی دور دراز مکانوں میں سے جھپٹا ہوا طوطا منہ میں دبائے ہوئے شیریں کے پاس آتا تھا۔ اور اس طرح سے شیریں کو ان اَدھ مرے جانوروں سے کھیل کود میں مشغول کر لینے میں کبھی کبھی کامیاب ہوجاتا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے مشغلہ کے بعد پھر شیریں کچھ بیزار سی معلوم ہونے لگتی تھی۔ فرہاد کو اپنی ان ناکام کوششوں کو جاری رکھنے کے واسطے بھی بڑی مشکلوں کے سامنے کرنے پڑتے تھے۔ اب وہ قریب قریب روزانہ اقبال احمد کی زد میں آجایا کرتا تھا۔ لیکن معمولی جوتے، رُول، پیپر ویٹ وغیرہ سے وہ کچھ زیادہ خائف نہ تھا۔ اس کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی تھی کہ جس طرح سے بھی ہو وہ شیریں کا غم غلط کرے۔ لیکن اکثر شیریں اس کو نہ ملتی تھی، اور وہ اس کی تلاش میں کمروں میں بھی گھس جاتا تھا۔ اور چونکہ فطرت سے مجبور تھا اس لئے اس دن جب اس نے کھلے ہوئے نعمت خانے میں سے پنیر کی بُو سونگھی تو شیریں کی تلاش ملتوی کر دی۔ نعمت خانہ کی طرف بڑھا۔ لیکن جیسے ہی وہ اندر گھسا دھڑ سے نعمت خانہ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فرہاد بڑے زور سے اُچھلا۔ اس کا سر دھکے سے ٹکرایا اور ساتھ

ہی ہاتھ میں سُتلی لئے اقبال احمد دوڑتے ہوئے نعمت خانہ کے پاس آئے۔ فر نے پھنکاریاں بھرتے ہوئے پیٹھ پر کے بال کھڑے کر کے پنجوں کے ناخن نکال نعمت خانہ کی جالی کو کھکوڑ مارا۔ ممکن تھا کہ وہ سخت جالی کو نوچ کر باہر نکل بھاگتا لیکن مہلت ہی نہ ملی۔ پہلے تو چاروں طرف سے بیت پڑنے لگے۔ پھر فرشی دری دوہری کر کے نعمت خانہ پر ڈال دی گئی۔ اب جو دروازہ کھلا اور وہ اس میں سے جھپٹا تو دری میں اُلجھا۔ خدا کی پناہ! کس مصیبت کا سامنا تھا۔ اوپر سے دبایا گیا۔ چاروں طرف سے دری کی تہوں میں لپیٹا گیا۔ اس لپیٹنے کی حالت میں سانس گھُٹتی تھی۔ ہاتھ پیروں کی ہڈیاں چاروں طرف کے دباؤ سے ٹوٹی جاتی تھیں۔ پنجے چلاتا تو کس طرح سے۔ اُلٹ اُلٹ کر ہر پہلو سے رکھا گیا۔ پھر اس کی دُم دری سے باہر کھینچ لی گئی۔ جس پر کہ ایک سُتلی اس زور سے کھینچ کر باندھی گئی کہ تکلیف سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ اس کش مکش کی حالت میں بڑی دیر تک وہ مبتلا رہا۔ خدا خدا کر کے اس دری میں سے جب اس کی رہائی ہوئی تو اُس نے اپنے آپ کو ایک ٹین کے چھوٹے سے تنگ و تاریک ڈبے میں مقیّد پایا۔ اس کی دُم کے وسط میں اب بھی ایسی تکلیف تھی کہ اُس کو معلوم ہوتا تھا کہ دُم وہاں سے کٹ کر گر جائیگی۔ وہ بیچارا سر گھما کر اپنی دُم تک مُنہ بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ گھومنا مشکل تھا۔ اس تنگ و تاریک قید خانہ میں ہوا کا گذر تھا اور نہ روشنی کا۔ عمر بھر میں پہلی مرتبہ اندھیرے سے سابقہ پڑا تھا۔ پنجے چلاتا بھی تو وہ بھی کارگر نہ ہوتے۔ ناخن ٹین پر کچھ کھچاتے ہوئے پھسلتے تھے۔

اس نے تکلیف اور غصّہ میں "نہ عاؤں، نہ عاؤں" کہنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اسی حالت میں گھنٹوں گذر گئے۔ اسے نہ معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی اس کا فولادی قید خانہ ہلتا تھا، کبھی پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ کبھی ہلتا تھا تو ہلتا ہی رہتا تھا۔ یہاں اس کی یہ حالت تھی کہ دم گھٹتے گھٹتے

بیچارہ عجیب نیم بیہوشی کی حالت میں تن بہ تقدیر پڑا تھا۔ آواز بھی کمزوری سے نہیں نکلتی تھی۔ اسی حالت میں اسے کچھ تازہ ہوا معلوم ہوئی۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ جان میں جان آئی۔ پھر اسے کچھ روشنی معلوم ہوئی اور تازہ ہوا بھی اور آئی۔ کوئی اس کا ڈبّہ کھول رہا تھا۔ کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ یہ اب بھی پیش آنے والی ہر مہم کے واسطے تیار ہو گیا۔ ٹھک۔ ڈھکنا کھلا۔ جھک سے اُجالا ہوا۔ فش شوں فرہاد پھنکارے۔ اور بڑی زور سے اُچھلے۔ مسز ہل "آئی مائی جیجز کرائیسٹ" کی کیک بھرتی ہوئی صوفے پر پیچھے جھکیں۔ اور فرہاد صاحب چاروں پنجوں کے بلیں ناخن ہوا میں چلاتے ہوئے ان کی گود میں اترے۔ مگر چونکہ دونوں میں ایک دوسرے سے کچھ بھی دلبستگی کا واسطہ نہ تھا اس لئے جس آناً فاناً میں یہ وصل ہوا تھا اس سے بھی جلد دونوں میں فصل ہو گیا۔ میم صاحب غسلخانہ کی طرف اور فرہاد صاحب برامدہ کی طرف بھاگے۔ ان کو تو غسلخانہ کا دروازہ بند کر کے امن حاصل ہو گیا۔ لیکن فرہاد بیچارے کی دُم کے پیچھے جھن جھناتی چھن چھناتی ایک ایسی بلا دوڑ رہی تھی۔ کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔ جو جو یہ جان توڑ کر بھاگتا وہ جھن جھناتی مصیبت اس کا پیچھا کرتی تھی۔

بھاگتے بھاگتے بیدم فرہاد حضرت گنج کے چوراہے پر پہونچے۔ وہاں پورے دو درجن سیاہ سفید گبڑے بابا لوگ مختلف قسم کے شیطانی مشاغل میں مصروف ہوا خوری کر رہے تھے۔ جنھوں نے چاروں طرف سے فرہاد پر یورش کی۔ کسی کی گگ پڑی۔ کسی کی ہاکی اسٹک اور ایک ڈھائی فٹ کا چقندری تو ایسا ہٹلر نکلا کہ اس کا لنگڑا پیخ فرہاد کی دُم پر پڑا۔ اور پڑتے ہی پیخ پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے اینچا تانی فرہاد کی طرف سے ہوئی کہ فرہاد کو چار و ناچار اپنی آدھی دُم وہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ خیر دُم گئی تو غم نہیں جان تو بچا لایا۔ اور دُم کے ساتھ جھنجھنوں سے تو پیچھا چھوٹا جو کہ تانبے کے تار سے اس کی دُم سے بندھے ہوئے اس کی دُم کے ساتھ بھوت کی طرح لگے ہوئے ڈرا ڈرا کر دُم ہی بجائے دیتے تھے۔ اب دُم اور دُم کے جنجال سے سبکدوش ہو کر ہلکا پھلکا بھاگا تو اس نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ راستے، گلی، کوچے اور محلوں کے جاننے کی کیا ضرورت

تھی۔ گھر کی سمت تک کے دریافت کرنے کی اس کو حاجت نہ تھی۔ قدرت نے بلیوں کو ایک خاص حس ایسی دی ہے چاہے جہاں اور جتنی دور ان کو بند کر کے لے جاؤ، اور چھوڑ دو، جب چلیں گی تو سیدھی گھر کی طرف۔ دم شکستہ فرہاد بھی چھتیں، دیواریں منڈیریں، گلیاں پار کرتے، کتوں سے بچتے، مرغیوں، کبوتروں اور چوہیوں کے دل ہلاتی پٹتے پٹاتے اور راستے بھر بقیۂ دُم کے فاؤنٹین پن سے سرخ روشنائی کی بوندیں ٹپکاتے آخر گھر آ ہی گئے۔

لیکن زمانہ ایک حالت پر نہیں ٹھہرتا۔ فرہاد اور شیریں کی زندگی نے اب ایک نیا دور اختیار کر لیا تھا۔ محبت کی پُر مسرت جستجوئیں اور ناکامیاں، گھتیں اور پریشانیاں مع اپنی پُر سحر دلچسپیوں کے ختم ہو چکی تھیں۔ اب ایک پھیکی اور سیدھی سادی زندگی یہ دونوں نسیمہ کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ فرہاد حلوائی کی دکان سے بالکل بے واسطہ ہو کر یہاں ہی دن رات رہتا تھا۔ اب اس گھر میں اس کیلئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اقبال احمد نے یہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ اپنی نئی بیوی مسز اَیل کو مسز اقبال بنا کر حضرت گنج میں رہنے لگے تھے۔

وہ غزالِ یاشکستہ سے سوا مظلوم نسیمہ بے زبان یاس کی پتلی، شیریں اور شیریں فرہاد ہی گیا، گھر بار، کپڑا پیسہ بلکہ خود اپنی جان سے لاپروا ایک مسلسل اچنبھے اور بیہوشی کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ گو اقبال اب بھی اس کو پچاس روپئے مہینہ خرچ کیلئے دیتے تھے۔ لیکن اس کو روپے کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس روپئے سے دلچسپی رکھنے والے افراد یعنی رحیمن اور عیدو نے باورچی خانے اور کوٹھڑیوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ باقی ماندہ گھر پر بظاہر قبضہ شیریں اور فرہاد کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دونوں کمرے کوٹھڑیوں اور برامدہ کے کونہ کونہ میں پڑے پھرتے تھے۔ گھر میں ہر طرف گرد اور کوڑا پھٹے ہوئے کاغذ اور کپڑوں کے چیتھڑے پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ صحن میں جا بجا گھاس اُگ کر اس پر کپڑوں میں چپٹنے والی بالیاں اُگ آئی تھیں۔ مرغیوں کے دڑبے

کے اُوپر اور چاروں طرف چرپٹے کے چھتے اُگے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی کے پاس ایک اونچا اُگالدان اتنے عرصے سے اوندھا پڑا تھا کہ اب وہ قریب قریب آدھا چولائی میں چھپ گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے کونے میں عیدو کے کھائے ہوئے آموں کے درخت اُگ آئے تھے۔ خود نسیمہ کی چارپائی کو برامدہ کے ایک کونے میں پڑے پڑے اتنا عرصہ گذر گیا تھا کہ چارپائی کے نیچے فرش پر چوکور نشان الگ نظر آتا تھا۔

نسیمہ کا سارا وقت بیٹھے چھالیا کترتے یا "راہِ نجات" اور "حلیمہ دائی" کی کتابوں میں سے کسی کو پڑھنے میں گذرتا تھا۔ اس کے پاس نہ صرف یہ دو کتابیں تھیں بلکہ کسی اور کتاب کے پڑھنے کی اس میں قابلیت بھی نہ تھی۔ یہ دونوں کتابیں اسے حفظ سی ہو گئی تھیں اور انہی کو بار بار پڑھتی تھی۔

حلیمہ دائی کی مختصر اور سادہ نظم کے ہر ہر شعر میں اُس کو عجیب و غریب پُر اسرار کشف اور دردِ پنہاں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مُقدس کتاب (جس کے اشعار کے لفظ بہ لفظ معنی بھی وہ نہ سمجھ سکتی تھی) ایک آنے والی پُر سکون اور اصلی زندگی کے مژدوں سے پُر تھی۔ وہ اس کو معصوم جذبے اور ایسے سچے اعتقاد کے ساتھ پڑھا کرتی تھی کہ آنسوؤں کی قطار اس وقت تک نہ ٹوٹتی تھی جب تک کہ کتاب اس کے سامنے رہتی تھی اور چونکہ بیوی کے آنسو بہتے تھے اس لئے رحیمن کا فرض تھا کہ خود بھی ٹپ ٹپ بوندیاں آنسوؤں سے ساتھ دیں۔ یا کم از کم سڑ اسڑ ناک ہی سُوںت سُوںت کر پلنگ کے پائے سے پونچھتی رہیں۔

ایک روز سہ پہر کے وقت نسیمہ حلیمہ دائی کا قصہ پڑھ رہی تھی۔ حسب دستور رحیمن پلنگ کی پٹی پکڑے زمین پر اکڑوں بیٹھی سُن رہی تھی۔ نسیمہ دو پیسے والی کتاب کے پارہ پارہ اوراق کو دونوں ہاتھوں سے تکیہ پر دبائے ہل ہل کر ایک سادے درد انگیز میلاد کے راگ میں ایک ایک شعر کو دو دو اور تین تین بار ادا کر رہی تھی۔ ادھر دوپٹہ سے آنسو پونچھے جاتی تھی۔ کہ یکایک عیدو اپنی ڈور کنکیا چھوڑ چھاڑ بھاگتا ہوا کوٹھے سے نیچے دوڑ آیا۔ اور ہانپتا ہوا پاس آ کر بولا: "بیگم صاحب کوئی آیا ہے"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ نسیمہ نے منہ اونچا کر کے پوچھا "کون ہے۔ کہتا کیوں نہیں"

"بیوی! کیا معلوم کون ہے؟"

"اے رحیمن! دیکھو جا کر۔ پوچھو کون ہے؟"

ڈیوڑھی سے بھرائی، گھبرائی ہوئی آواز آئی "اقبال احمد۔ اقبال احمد"

نسیمہ کے منہ پر مسرت اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے جلدی سو سر پر دوپٹہ درست کیا۔ اور پھر "اے دیکھنا رحیمن میاں بھائی ہیں میاں بھائی" کہتے ہوئے چارپائی سے نیچے اتری۔ سڑ پڑ سڑ پڑ جوتیاں پہنتی چار قدم آگے بڑھ کر مؤدب کھڑی ہوگئی۔ رحیمن نے سمٹ سمٹ کر دوپٹہ سنبھالنے، ہنسی کے روکنے کے سو سو نخروں کے بعد ڈیوڑھی میں جھانکا۔ پھر اندر دبکیں سمٹیں، آدھی ٹیڑھی ہوئیں اور شیریں آواز نکالنے کی کوشش میں چیں چیں کر کے منمنائیں "آئیے میاں اندر آئیے"

لمبا قد، سفید کپڑے، سیاہ چھدری ڈاڑھی، چوڑا چہرہ، سرخی مائل گندمی رنگ۔ ایک ہاتھ میں عصا دوسرے ہاتھ میں چمڑے کا ہینڈ بیگ۔ نسیمہ کے بھائی منشی کاظم حسین سب رجسٹرار تیزی سے گھر میں داخل ہوئے۔ اور بیچ انگنائی میں جھجک کر مستقل طور پر ساکت کھڑے ہو گئے۔ نسیمہ نے مجبوراً تیسری دفعہ جھک کر تسلیم کی۔ نسیمہ کے بھائی نے بآواز بلند کلمہ پڑھا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔

نسیمہ گھبرا گئی۔ شرم و لحاظ کو قدرے پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھی "خیر تو ہے میاں بھائی۔ میرے اللہ خیر تو ہے۔ کیا بات ہے میاں بھائی؟"

منشی کاظم حسین صاحب نگاہیں نسیمہ پر ایکساں جمائے ہوئے سیدھے ہی کھڑے کھڑے گھٹنے ٹیڑھے کرتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے ہوئے۔ عصا اور ہینڈ بیگ کو نہایت سے زمین پر رکھ کر پھر ویسے ہی نگاہیں جمائے ہوئے آہستہ آہستہ سیدھے ہوئے۔ دونوں ہاتھ اٹھائے، ماتھے اور آنکھوں پر سے پھیرتے ہوئے ڈاڑھی کی نوک تک لائے اور پھر قرأت سے، شکر الحمد للہ کہا۔

یہ سین شیریں فرہاد دونوں کے سوا سب کیلئے پُر ہیبت تھا۔ چنانچہ آگے آگے فرہاد اور ان کے پیچھے شیریں گھر کو چھوڑ زینے پر سے ہوتے ہوئے کوٹھے پر پہنچ گئے اور کئی گھنٹے واپس نہ آئے۔

اس عرصے میں بھائی بہن میں کافی گُفت و شُنید ہو جانے سے قدرے سکون پیدا ہو گیا۔ کاظم نے بتایا کہ اس کو اقبال احمد کا تار ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر اپنی بہن کا آخری دیدار کرنا ہے تو کر لو کیونکہ وہ حالتِ بیماری میں دم توڑ رہی ہے۔ گھنٹوں کی مہمان ہے۔

نسیمہ نے اب اپنی پوری سرگذشت سُنائی۔ اور اقبال کیا کہ بیشک وہ اپنے خطوط میں ان کو صحیح حالات سے آگاہ نہ کرتی تھی۔ اور بیشک بھائی کے بُلاوے کے خط انہیں کو ملے۔ جن کا وہ کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی زار و قطار روتے ہوئے ہچکیاں لے لیکر کہا "میاں بھائی آپ جئیں ہزاروں برس پھلیں پھولیں خوشیاں کریں، بہویں لائیں۔ یہی میری دُعا ہے، یہی میری تمنا ہے۔ لیکن سمجھئے تو میرا تو یہی گھر ہے۔ جیتے جی اب اس کو کیسے چھوڑوں۔ اسی گھر کی دہلیز پر میرا دم نکلے یہی میری آرزو ہے۔ قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ اس گھر کو چھوڑوں تو دُنیا اور آخرت دونوں میں مُنہ کالا ہو۔ یہ میرا گھر ہے میں اس کو کیسے چھوڑ دوں"

کافی احتیاط اور بار بار آزمانے کے بعد یہ دونوں گھر میں تو آ گئے لیکن رات بھر سوئے ہوئے کاظم حسین کی ڈاڑھی اور ڈنڈے کو مُشتبہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اور صبح ان کے بیدار ہوتے ہی یہ دونوں پھر گھر سے بھاگ کوٹھے پر پہنچ گئے۔ اور کوٹھوں کوٹھوں پھرنے لگے۔ فرہاد نے برابر ہی کے دو منزلہ مکان کے زینے میں دھنی کے اندر چھپا ہوا گلہری کا ایک جھونجھ ڈھونڈھ لیا۔ یہ بڑا ہی پُر لطف مشغلہ تھا۔ شیریں اور فرہاد بار بار کھوری اینٹوں کی دیوار میں پنجے جما کر دھنی تک چڑھنے کی کوشش میں مشغول ہو گئے۔ حالانکہ وہاں تک پہونچنا ان کیلئے ناممکن تھا۔ پھر بھی ان کو دیوار پر چڑھنے اور

گرنے میں بڑا مزہ آرہا تھا۔ کیونکہ گلہری خانم دیوار کی کارنس پر بیٹھی دُم پھلائے چررر چرچرچرر ایکساں شور مچا رہی تھیں۔ اس لئے یہ دونوں اور خوش ہو ہو کر ان کو اور ڈرا رہے تھے۔ لیکن اسی اثنا میں شیریں کو اپنے گھر میں بڑی پاٹ دار آوازیں جھرجھراتی اور تھرتھراتی سُنائی دیں۔ فوراً اس کا دل کھٹکا۔ نسیمہ کی یاد آئی سیدھی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اقبال احمد اور کاظم حسین گھر کے آنگن میں کھڑے گلے پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے پر زبانی حملہ کر رہے تھے۔ نسیمہ باورچی خانہ کا کھمبہ پکڑے کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ رحیمن زمین پر اکڑوں بیٹھی نسیمہ کی پنڈلی پر ماتھا ٹیکے رو رہی تھی۔ وہ مہینوں بلکہ برسوں بیوی کی خوشنودی کے واسطے حلیمہ دائی کے قصے پر نسیمہ کے ساتھ روتی رہی تھی۔ اس نے مہینوں نہیں بلکہ برسوں دو آنے سیر کا نمک لا کر دیا تھا۔ لیکن یہ بچی اور پیٹ کی باتیں تھیں۔ آج ان سب جذبات کو ایک طرف کر کے وہ دل توڑ توڑ کے رو رہی تھی۔ آج اس کا دل نسیمہ کی معصوم ہستی، نسیمہ کی پاک اور سچی ذات اور صرف ذات ہی سے جُدا ہونے کے غم میں بیٹھا جاتا تھا۔

برامدہ میں گھڑونچی کے پاس عبدو کھڑے رو رہے تھے اور کٹورے پر کٹورا پانی کا پی رہے تھے۔ آج ڈور، کنکیوں، لٹو اور پھرکیوں کی محبت غائب ہو کر ایک سچی اور پیاری ہستی، ماں سے بھی زیادہ مُشفق دیوی کے چُھٹنے کا غم ان کو بیتاب کئے ہوئے تھا۔ اسی وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نسیمہ کی کتابوں کا جُزدان بن جائے۔ اور ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ چلا جائے۔ چونکہ یہ خیال بار بار ناممکن معلوم ہوتا تھا اس لئے پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا اور بھر بھر کٹورے پانی پیتا تھا۔ شیریں کا بس نہ چلتا تھا کہ کیونکر اقبال احمد اور کاظم حسین دونوں کا ٹیٹوا چبا جائے۔ اس کو اس سے کچھ واسطہ نہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں کا ایک دوسرے پر گلے پھاڑ پھاڑ کر چلانا بہت ہی ناگوار تھا۔ وہ نسیمہ کے پیروں کے اردگرد بار بار پھرتی تھی اور بیکس ماؤں ماؤں کرتی تھی۔

سسکیاں، ہچکیاں، ماؤں ماؤں کچھ کام نہ آئے۔ تو پھر لیں اُجڑا اور یوں اُجڑا

نسیمہ کا چھوٹا سا گلشن جس میں بہار آتے ہی جا چکی تھی ۔ جو برسوں سے پامالِ خزاں پڑا سنسناتا تھا ۔ آج وہ بھی نہ رہا ۔ چل چلاؤ ۔ خاتمہ ۔ خاتمہ !

کچھ سامان اِدھر سے اُدھر ہوا ۔ کچھ اندر سے باہر ، کچھ باہر سے اندر ۔ مٹی کے چند گھڑے پھوڑے گئے ۔ کچھ کاغذات پھاڑے گئے ۔ کچھ پھٹے پرانے کپڑے پھاڑے گئے ۔ کچھ بانٹے اور پھینکے گئے ۔ چینی کے ٹوٹے برتن ، خالی ٹین اِدھر اُدھر پھینکے ۔ گھر کا کوڑا دو چند اور سہ چند ہوا ۔ یعنی نسیمہ کا اسباب بندھا اور ٹھیک ہوا ۔ بند گاڑی کھڑکھڑاتی آئی ۔ سامان رکھا گیا ۔ نسیمہ نے مڑ کر اس سات برس پُرانے قید خانہ کو پھر دیکھا ۔ آخری مرتبہ پھر اُبل کر روئی ۔ شیریں کیا کرتی ۔ ماؤں ماؤں کرتی ایکہاں صدقے ہوتی تھی ۔

کاظم حسین نے گھر کا "بس رو چکیں ۔ اب بھی دل نہیں بھرا ۔ اُٹھو خدا کیلئے !"

نسیمہ نے شیریں کو گود میں لے لیا اور بھائی کے پیچھے پیچھے گھر سے نکل گاڑی میں سوار ہو گئی ۔ جانوروں کو بھول جاؤ ۔ ان سے بے توجہ ہو جاؤ تو اس کا ان کو شکوہ نہیں ہوتا ۔ محبت اور توجہ کرو تو وہ مشکور ہوتے ہیں ۔ اور خوش ہوتے ہیں ۔ شیریں کو آج پورے ایک برس کے بعد نسیمہ نے گود میں لیا تھا ۔ اس کو اس کی انتہا سے زیادہ خوشی تھی ۔ حالانکہ گاڑی کی کھڑکھڑ اور ہل جُل اور دھچکوں سے وہ بہت گھبرا رہی تھی ۔ لیکن نسیمہ ہی کے چمٹی بیٹھی رہی ۔ اب گاڑی اسٹیشن پر پہونچی ۔ تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ آیا ۔ سامان اُترا ۔ یہ لوگ اترے ۔ لیکن یہاں بے شمار آدمی ہر طرف پھیلے ہوئے آ جا رہے تھے ۔ اور اُن میں پچاسوں خوفناک کتے بھی پھر رہے تھے ۔ شیریں کا نسیمہ کے بُرقعے کے اندر دم گھُٹتا تھا ۔ باہر اُن سب کو دیکھکر دل دہلتا تھا ۔ یہاں آ کر وہ بہت پریشان تھی ۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے ۔ کدھر جائے اور کدھر چھُپے ۔ ایک دفعہ ہاتھوں سے نکل ، کہیں ہوئی نسیمہ کے پیچھے پہونچی ۔ دو کتے اس پر جھپٹے بیچاری بھاگی اور ایسی بھاگی کہ پھر نہ اُسے پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور نسیمہ کدھر ہے ۔ فطرت کا تقاضہ تھا کہ چل اسی گھر کی طرف چل ۔ عقلِ کوتاہ بھی یہی کہتی تھی ۔ وہی گھر ، وہیں بیوی ہونگی ۔ چنانچہ آٹھویں حاس کی مدد سے یہ روانہ ہوئی اور سیدھی گھر کی طرف چل دی ۔

جس وقت وہ گھر پہونچی۔ دن کے دو بجے تھے۔ اکّا دُکّا چیلیں آسمان پر منڈلا رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بگولے چھت پر سے ہوتے ہوئے صحن میں اُترتے تھے۔ اور صحن کے کونے میں چکّر لگا رہے تھے۔ یہاں کاغذ کے پُرزے، جھاڑو کے تنکے، دونوں کے پیچھے بار بار اِدھر اُدھر سے لپک لپک کر گول گول چکّر، گھمیاں کھاتے ہوئے چھت کی طرف اُڑتے تھے۔ اور پھر یاس اور حسرت کی حالت میں گر کر بے حس ہو جاتے تھے۔ گھر میں ہر طرف کوڑا تھا۔ باورچی خانے کے سامنے کوئلہ کا گھڑا لوٹا پڑا تھا۔ کوئلے اور راکھ بکھری پڑی تھی۔ برامدہ میں نسیمہ کی برسوں پُرانی چارپائی برسوں پُرانی جگہ سے دُور دو پاؤں پر دیوار سے لگی کھڑی، اوپر کے دونوں ہاتھ پھیلائے دُعا کی حالت میں گریاں معلوم ہوتی تھی۔ ان کے پاس رحیمن کا ٹین کا پاندان خالی اور اَوندھا پڑا اداس رہا تھا۔ خاموش دُنیا سے علیحدہ راہبوں کی سی زندگی بسر کرنے والے اس گھر کے تین نفر برسوں سے اس اُجڑے ہوئے گھر میں سب سے الگ تھلگ چپکے پڑے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کسی طرح کا اُن کے وجود سے دُنیا پر کوئی بار نہ تھا اور نہ یہ دُنیا میں مُخل تھے۔ مگر آج وہ بھی نہ تھے۔ ڈیوڑھی میں تالا پڑا تھا۔ گھنٹوں شیریں اور فرہاد ماؤں ماؤں کرتے پھرے۔ مگر سب بے سُود، شام ہو گئی۔ اندھیرا چھانے لگا مگر اس گھر میں چراغ جلانے والا کوئی نہ تھا۔

اقبال احمد کی صورت سے ایک سے زیادہ دوسرے کو نفرت تھی۔ شیریں اور فرہاد دونوں اس کو حقیر اور ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جو کچھ ہوا وہ پُرانے دوست نہ تھے نہ سہی گھر تو یہ اُن کا ہی تھا۔ اس ظالم کو کیا حق تھا کہ وہ اس طرح سے گھر میں گُھس کر کھڑ بڑ کرتا۔ سامان اُٹھاتا رکھتا پھرے۔ ان دونوں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ چاہے جو کچھ بھی بھگتنا پڑے وہ اس گھر کو نہ چھوڑیں گے۔ کمروں میں سامان کے پیچھے چھپے ہوئے یہ دونوں اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک اقبال احمد ان کے پاس نہ آجاتا تھا پھر دونوں وہاں سے بھاگ کر دوسرے کمرے میں اور سامان کے پیچھے جا چھپتے تھے۔

اقبال احمد پسینے میں شرابور منہ میں سگار دبائے میزوں اور کرسیوں کو گھسیٹتے چارپائیوں کو دھکیلتے، بچھونوں کو کھڑکھڑاتے مسلسل دو گھنٹے تک پھرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے کمروں میں تالے لگائے۔ گھر سے باہر نکلے، ڈیوڑھی میں تالا لگایا۔ اور بےبی آسٹن پر بیٹھ کر گرد میں اُڑتے چل دیئے۔ یہ واقعہ نسیمہ کی روانگی کے دوسرے روز ہوا۔ اور اس طرح شیریں اور فرہاد سچے عاشق و معشوق کی طرح ایک ساتھ مرنے کے واسطے کمرے میں بند چھوڑ دیئے گئے۔

کچھ دیر تو اپنے اس طرح قید ہو جانے کی اہمیت کو یہ لوگ نہ سمجھ سکے۔ گھر میں خاموشی ہو جانے کے بعد انھوں نے کمرے کے بے ترتیب سامان میں چھلی چھلیا کھیلی۔ سامان جس قدر تتر بتر تھا اتنی ہی اُن کو اس سے دلچسپی تھی۔ کیونکہ اس میں سے ایک آدھ چوہے یا چوہیوں کی کھسکھساہٹ معلوم ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی ان کی جھانکتی ہوئی کھوپریاں ان کو نظر آتی تھیں۔ کافی جستجو کے بعد فرہاد نے ایک چوہا بھی پکڑ لیا اور جب اُسے اَدھ مرا سا چارپائی پر لایا تو برابر کی میز کے اوپر رکھی ہوئی کُرسی پر سے شیریں نے جست کی اور چوہے کو چھین لیا۔ کچھ دیر تک چھینا جھپٹی ہوا کی۔ لیکن اب شام ہو رہی تھی کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ ختم برسات کی گرمی سے کمرے میں گھٹن معلوم ہوتی تھی۔ مرے ہوئے چوہے کو چھوڑ کر یہ دونوں دروازے کے پاس آئے۔ بار بار اس کے سامنے ٹہلے۔ پنجوں سے کھس کھسایا۔ کمرے میں چکر لگایا اور پھر دروازے کے پاس آ گئے۔ اس کمرہ کا یہ ہی ایک دروازہ تھا۔ دوسرے راستے کی تلاش بیکار تھی۔ پھر بھی یہ کمرے میں رات بھر چکر لگا کر ساری رات اور دروازوں کی تلاش بھی کرتے رہے اور ہر چکر میں اس دروازے کی درار میں ناک رگڑتے تھے۔ ان کو اس کمرے میں کھانے کے واسطے مُطلقاً کچھ میسّر نہ تھا۔ ایک کونے میں البتہ تانبے کی مٹکی میں پانی بھرا رکھا تھا اور اس کو چاٹ چاٹ کر باہر نکلنے کی بے سُود کوشش میں مُتواتر پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوسرا دن بھی گذر گیا۔

بلیاں چوہے کا شکار شوقیہ کرتی ہیں۔ اور صرف سر چبا کر اس کو پھینک دیتی ہیں

ان کے مذہب میں چوہا کھانا جائز نہیں ہے۔ اب بھوک کے مارے یہ حالت ہوگئی تھی کہ روزِ گذشتہ کا مرا ہوا چوہا دونوں نے خوب کھایا۔ اور اب جو پیٹ میں غذا پہونچی اور بھوک میں چوہے کے گوشت کی لذت معلوم ہوئی تو دونوں نے مل کر اب چوہے اور چوہیوں کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن افسوس کہ اُن کی تیس گھنٹے کی متواتر موجودگی کی وجہ سے سب چوہے اور چوہیاں اس کمرے اور اس کمرے کے بلوں پر لعنت بھیج کر چل دیئے۔ غرض یہ کہ بھوکے پھرتے پھرتے ان کو چار دن اور چار راتیں ہوگئیں۔ اب یہ دونوں کونوں کھتروں میں سے جھینگروں کی تلاش کر کے کھا رہے تھے۔ صرف پانی زندگی کو کہاں تک برقرار رکھتا۔ جو جو وقت گذرتا گیا ان کی قوت زائل ہوتی گئی۔ اب یہ دونوں کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ماؤں اور عاؤں کی صدائیں از خود نکالتے تھے۔ ان کے چکرائے ہوئے دماغ اور دُھندلی آنکھیں ہر کونے میں انھیں جھانکتے ہوئے چوہے اور چوہیاں دکھاتی تھیں۔ یہ بار بار اُمید کی قوت پر اُٹھ کر جاتے تھے اور پھر ڈگمگاتے ہوئے "ماعوں ماعوں" کی دم توڑ آوازیں نکالتے دروازے کے پاس آجاتے تھے۔

جو جو وقت گذرتا گیا ہانپ ہانپ کر دم توڑ جواب دیتے گئے۔ آوازیں کمزور ہوتی گئیں اور ان کے درمیان وقفے بھی زیادہ ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ دسواں دن بھی گزر گیا۔ شیریں جو فرہاد سے کچھ دُور پڑی تھی خاموش ہوگئی۔ فرہاد اب بھی آدھ آدھ گھنٹے کے بعد نحیف "عععا" کی آواز نکالتا تھا۔ اس کی کمزور آنکھیں کبھی کبھی از خود روشنی سے منور ہو جاتی تھیں۔ وہ چاروں طرف غذا کی تلاش کرتی تھیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اپنی آخری دم کے سنبھالوں میں اس نے چاروں طرف دیکھا تو اسے ایک طرف گوشت کا چھوٹا سا ڈھیر معلوم ہوا۔ پچھلے پیروں کو زمین پر گھسیٹتا ہوا اگلے پنجوں کے سہارے آگے کھسکتا بڑھا۔ مگر وہاں کیا تھا۔ دھوکا تھا۔ گوشت نہ تھا۔ اس کی محبوبہ شیریں کا خشک ڈھانچہ آخری اور کمزور سانسیں اب بھی لیتا ہوا موجود تھا۔ ہاں شیریں وہی شیریں تھی۔ اس کو دیکھا، سونگھا، گھوما اور پھر انھیں پنجوں سے نڈھال

دھڑ کو گھسیٹتا دروازے کی درار تک آیا۔ اور پڑ گیا۔ ایک ایک منٹ کئی کئی گھنٹے کے برابر تھا۔ چکر تھے، غنودگی۔ پھر زندگی کی لہر سی دوڑی۔ خون میں ہیجان سا ہوا۔۔۔ آنکھوں میں بصارت آئی اور پھر وہی گوشت کا دھوکا ہوا۔ فرہاد پھر گھسٹتا ہوا اس طرف گیا۔ مگر گوشت نہیں وہ تو شیریں تھی۔ اس نے سونگھا۔ بُو تھی، شیریں کی بو تھی۔ اور شیریں کی بُو میں گوشت کی بُو تھی۔ اس نے چاہا پھر وہاں سے واپس ہو لیکن نقاہت نے مجبور کر دیا۔ اسی کوشش میں اس کا سر بے قابو ہو کر کچھ سے زمین پر گرا۔ بے ہوشی سی چھا گئی۔ اور پھر جب ہوش آیا تو گوشت کی بُو آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو شیریں کا تنِ لاغر اب بھی بقیدِ حیات تھا۔ دفعتہً فرہاد کے نامکمل حیوانی دماغ نے شیریں اور غذا دونوں کو ایک ہی نقطۂ خیال میں وابستہ کر دیا۔ ایک ایک انگل آہستہ آہستہ اس نے اپنا سر بڑھایا۔ جبڑا کھولا اور شیریں کا گلا دبایا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، فرہاد کو دیکھا اور آخری مرتبہ خفیف "ماؤں" کی آواز نکالی۔ فرہاد نے پورا زور لگا کر تیز دانت شیریں کے نرخرے میں گھسا دیے اور پھر ساکت سا ہو گیا۔ اس سے زیادہ قوت اب اس میں نہ تھی۔ رِستے رِستے سوکھے ہوئے خون کی چند بوندیں نکلیں، زبان پر آئیں۔ دو دو بوند اور دو دو بوند خون اس کے حلق سے اُترا۔ اور آہستہ آہستہ قوت کا ہیجان فرہاد کے دست و پا میں پیدا ہوا۔ اب اس نے گوشت بھی کھایا قوت آئی۔ پیاس معلوم ہوئی مٹکی میں سے جا کر پانی پیا۔ آنکھیں کھُل گئیں، ہاتھ پیروں میں جان آ گئی۔ اصلی تڑپتی ہوئی بھوک از سر نو پیدا ہوئی۔ اب یہ معمولی غذا کی طرح شیریں پر جھک گیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد چند ہڈیوں کے سوا شیریں کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

طویل فاقے کے بعد شکم پُر فرہاد نشہ کی حالت میں ایک صندوق پر بیٹھ کر نیند کے جھونکے لینے لگے۔ اور ابھی اسی حالت میں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باہر گھر میں کھٹ پٹ ہوئی۔ اقبال احمد اور چند ملازموں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اس کمرے کے دروازے کی کنڈی کھٹکی۔ دروازہ کھلا۔ تھکے نشے میں چور، کمزور اور پیٹ

پھولے ہوئے فرہاد بادلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور ڈگمگاتے، جھومتے آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل زینے پر سے ہوتے ہوئے کوٹھے پر چل دیئے۔

عرصے تک لوگوں نے بدہیئت، سیاہ، دُم کٹے بلے کو بھیانک آوازیں نکالتے دیوار دیواروں پھرتے دیکھا۔ عقل اور حافظہ سے مجبور فرہاد اس واقعے کے بعد مدتوں شیریں کو کوٹھوں کوٹھوں، گلیوں گلیوں اور گھروں گھروں تلاش کرتا پھرا۔

فرہاد، اے حیوانی فرہاد، ناشنیدہ ظلم کے بانی فرہاد، تیری ہستی قابلِ قدر ہستی ہے۔ شیریں کی موت کتنے ہی بُرے پہلو کیوں نہ دیکھی جائے وہ ایک موت بھی جو آناً فاناً میں آگئی۔ جس کے مصائب وہیں ختم ہو گئے۔ مگر آہ نسیمہ تجھ کو موت کب آئیگی۔ تیری مصیبتیں کب تک ختم ہونگی۔ تو کب تک بھائی کے گھر میں روٹیاں تھوپے گی۔ برتن مانجھے گی اور کب تک بدمزاج ضدی بھتیجے بھتیجیوں کے زیرِ مشق رہے گی۔

بے زبان

پانچسو روپیے کے انعام کا اعلان سُن کر باری باری سب ہی نے کوشش کی۔ ہندوستانی چابک سوار، کابلی پٹھان، توپ خانہ کے گورے اور سپاہی ایک کے بعد ایک کتنے ہی گھوڑی پر سوار ہونے کے واسطے سرکس کے دائرے میں داخل ہوئے۔ اور طرح طرح سے کوششیں کیں۔ لیکن گھوڑی پر سوار ہونا تو درکنار اس کی راس تک چھونا نصیب نہ ہوئی۔ جو بھی آگے بڑھا دونوں کان پیچھے سکیڑ، دانت نکال ہنہنا کر گھوڑی ایسی کاٹنے کو دوڑی کہ بہت سے تو جب ہی گرتے پڑتے سرکس کی دیوار پھاند باہر بھاگے۔ اور اگر ایک آدھ ڈھیٹ بیت یا چابک گھماتا کھڑا بھی رہ گیا تو پھر گھوڑی نے گھوم گھوم کے ایسی دولتیاں چلائیں کہ آخر مجبور ہو کر اس کو بھی پشیمان اور شرمندہ باہر آنا پڑا۔

سرکس کے منیجر نے جو نیچی سی دیوار کے باہر کھڑا تھا چاروں طرف سر گھما گھما کے تماشا دیکھنے والوں کو مخاطب کر کے پھر اعلان کیا "اتنا جنٹلمین سپاہی اور جوان چاروں طرف ہے۔ کوئی اور آئے، آئے، آئے! جس کا ہمت ہو۔ جو کوئی اس گھوڑی پر

بیٹھے گا اور چار قدم چلائے گا سرکس کمپنی اس کو پانچ سو روپئے انعام دیگا" چاروں طرف کوچوں، کرسیوں اور پھر چھت تک اُٹھتی چلی گئی۔ بنچوں پر ہزاروں آدمی بیٹھے تھے۔ سرکس کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن اب کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کوئی آئے۔ ہر طرف سب خاموش شرمندہ سے بیٹھے تھے۔ اور ان کے سامنے تماشے کے چھوٹے سے گول چکر کے بیچ میں چمکدار سیاہ، چکنی چپڑی، تندرست، نوجوان، پھرتیلی چلبلی گھوڑی گردن کو محرابی خم دیئے، ہنہناتے ہوئے سر کو جھٹکے دیدیکر اور دُم کی چوری جھپکا جھپکا کر اگلے پیروں سے زمین پر ٹاپیں مار رہی تھی۔ اس کی اس حرکت میں فتح کی مسرت حُسن کا غرور اور شباب کی پھڑک عیاں تھی۔ اور اس وقت جبکہ دُنیا بھر کی نگاہیں اس سیاہ گھوڑی پر جمی ہوئی تھیں سرکس کا چور دروازہ آہستہ سے کھلا۔ سن سے بھاگتی ہوئی ایک لڑکی ہوا کی طرح آئی۔ بجلی کی طرح اس کا ہنٹر کوندا۔ گھوڑی اُچھلی، بھڑکی اور بھاگی۔ ہنٹر کوندا اور پھر کوندا۔ گھوڑی جان توڑ۔ سرکس میں چکر لگانے لگی۔ اب سب کی نگاہیں اس سفید انسانی بچھڑی پر جم گئیں۔ بوٹا سا قد، دوہرا جسم، سیاہ بال، کھال سے چمٹا، چُست سرکس کا لباس۔ حُسن تھا، جادو تھا۔ قہر تھا کہ سحر تھا۔ اس کے ہاتھ۔ اس کے پیر۔ اس کا سینہ۔ اس کی گردن۔ اس کا سر، اس کی آنکھیں ہر ایک کشش دل کا مرکز تھا۔ اور کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک مجسمۂ شباب تھی۔ اس کی ہر بات میں شوخی تھی۔ شرارت تھی۔ ہاتھوں میں پھڑک تھی، پیروں میں تھرک تھی۔ گردن میں لچک تھی، آنکھوں میں چمک تھی۔ دُنیا اس کو تکتی تھی اور وہ بے خبر تھی۔ ہنٹر گھماتے گھماتے ایک دفعہ وہ لپکی۔ سپاٹے بھرتی گھوڑی پر ہاتھ لگاتے ہی بجلی کی پھرتی سے سوار ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں سے کھلے ہوئے بالوں کو سنوارا۔ اور پھر بھاگتی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر کھڑی ہوگئی۔ گھوڑی نے چکر پر چکر اور تیزی سے لگانا شروع کر دیئے۔ اس وقت اس کے کھلے ہوئے سیاہ بال گلابی ربن کی بندش سے آدھے آزاد پیچھے پیچھے پھر پھرا رہے تھے۔ اس کی چُست پاجامہ میں ملفوف گول گول ٹانگیں ہلکے ہلکے لچکتی تھیں۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے تھے۔ سرپٹ بھاگتی ہوئی گھوڑی پر وہ ایک رقص سا کر رہی تھی۔ سب کی

نگاہیں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں۔ وہاں چور دروازہ آہستہ سے پھر کھل چکا تھا۔ چکر لگاتے لگاتے ایک دفعہ اُدھر گھوم، گھوڑی مع سوار اس کے اندر غائب ہوگئی۔ کئی سکنڈ تک تماشبین سکتے کی سی حالت میں خاموش رہے۔ اور پھر تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اُٹھالیا۔

سرکس کے لکھنؤ آنے کے چند ہی دن بعد سارے شہر میں گھوڑی اور لڑکی کا شہرہ ہوگیا۔ ان دونوں کے حسن، خوبصورتی، شرارت اور شہسواری پر طرح طرح کے اظہار خیال ہونے لگے۔ اور بیسیوں روایتیں، افواہیں پھیلتی چلی گئیں۔ کسی کا خیال تھا کہ لڑکی آوارہ ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ سرکس والوں کی سخت نگرانی کرنا اور کسی کی ہوا تک نہ لگنے دینا مصلحت سے خالی نہیں۔ بعض کا شُبہ تھا کہ لڑکی اور مالک سرکس کے گہرے تعلقات ہیں۔ اور بعض کو یقین تھا کہ لڑکی مالک کی بیٹی ہے۔ مگر اصل میں یہ سب عقلیہ گدے ہی تھے۔ کیونکہ سرکس کے کارکنوں اور اداکاروں سے ملاقات یا واقفیت کسی کو بھی حاصل نہ تھی۔ سرکس کے چھوٹے بڑے جانور ان کے پنجرے اور کام کرنیوالوں کی چھولداریاں اور سب کے چاروں طرف اونچی اونچی قناتیں کھڑی کر کے ان کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سرکس کے مالک یا منیجر کی اپنے لوگوں پر سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی سے نہ ملیں جُلیں اور نہ باہر جائیں۔ ایسی حالت میں لکھنؤ کی مخصوص خلقت یعنی شوقین آوارہ منش اور مفلس شرفا قناتوں کے چاروں طرف اور بھی زیادہ چکر لگانے لگے۔ کوئی قناتوں کے نیچے سے جھک کر دیکھتا تھا۔ کوئی دروازہ میں سے جھانکتا تھا۔ اور اس طرح سے اگر کسی کو ہاتھی کے پیر دوں، شیر کے کٹہرے یا ایک آدھ آدمی کی جھلک نصیب ہو جاتی تو پھر وہ طرح طرح کے چشم دید افسانے بیان کرتا پھرتا تھا۔ ان سب باتوں کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شہرت نواب محمود علی خاں تعلقہ دار ڈیبا بادگنج پہونچی۔ اور ایک دن وہ خود سرکس کا تماشا دیکھنے آ پہنچے جہاں ان کے واسطے نشستیں مخصوص کر کے آراستہ کر دی گئی تھیں۔ نواب نے سب کرتب جیت

سے دیکھے اور پسند کئے۔ لیکن سب سے زیادہ اس لڑکی اور گھوڑی کا کھیل پسند کیا۔ تماشا ختم ہونے پر انھوں نے مینجر سرکس کو اپنی نشست پر طلب کیا۔ اور بڑی دیر تک اُن کے سرکس کی تعریفیں کیں۔ خاص کر اس لڑکی کی، یہاں تک کہ انھوں نے انعام دینے کے واسطے لڑکی کو بھی اپنے پاس بُلانا چاہا۔ مگر جب مینجر سے یہ معلوم ہوا کہ لڑکی کا تماشا کرنے کے علاوہ باہر آنا ممکن نہیں ہے تو مینجر کیلئے اپنی رسٹ واچ اور پچاس روپئے لڑکی کے واسطے انعام بھجوا دیئے۔ نہ صرف یہی بلکہ دوسرے روز پھر تماشے میں بہت پہلے سے آگئے۔ مینجر کو بلوا لیا۔ دُنیا بھر کی باتیں اور ہر پھر کے لڑکی کے متعلق اور گھوڑی کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن اس وقت مینجر اپنا زیادہ وقت نواب صاحب کو نہ دے سکا۔ اسے تماشے کی جلدی تھی اس لئے چلا گیا۔ تماشا ختم ہونے پر وہ خود ہی پھر آگیا۔ نواب صاحب نے سَو سَو کے پانچ نوٹ سرکس کو انعام میں دیئے۔ بڑی دیر تک باتیں کیں۔ اتنی کہ رات گئے واپس ہوئے۔ دوسرے دن نواب صاحب نے مینجر کو اپنے محل پر صبح کے کھانے پر دعوت دی، نواب صاحب کی اس خاص توجہ اور مہربانی کا مطلب مینجر سرکس بھی پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ سو سے اوپر محل پینسٹھ برس کی عمر، نواب صاحب کی دولت اور اس کے استعمال سے کون ایسا تھا جو واقف نہ تھا۔ جہاندیدہ جہاں گشت مینجر نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہی موقعہ ہے جو کچھ بھی کمایا جا سکے کما لیا جائے۔ اس لئے اس نے بڑی تدبیر اور دُور اندیشی سے کام لیا۔ کھانے کے بعد جب اصل معاملے کی باتیں شروع ہوئیں تو اس نے پہلے تو بڑی ہی پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر کی۔ اس معاملہ میں کچھ سُننا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکی کا باپ اور بڑا بھائی دونوں ساتھ ہیں۔ سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن پھر بعد میں جب اس کو بہت کچھ لالچ دیا گیا تو بہت ہچکچاہٹ کے بعد ایک تجویز اس طرح پیش کی:۔

”نواب صاحب آپ کے اخلاق اور مہربانی نے مجھ کو مجبور ہی کر دیا۔ لیکن حضور دیکھیں کہ میں کس قدر خطرناک کام کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ اگر کچھ بھی گڑبڑ ہو گئی

تو دس بارہ برس جیل خانہ میں چکی پیسنا پڑے گی۔ بہرحال اب جو کچھ بھی ہو آپ کا کام تو پورا کروں ہی گا۔ کل اتوار کا تماشا ختم کر کے ہم لوگ پرسوں یہاں سے کانپور جانے والے ہیں۔ آپ پیر کی صبح کو اپنا موٹر خود ہی لیکر ہم لوگوں کی قناتوں کے دروازے پر آئیں اور انتظار کریں۔ لڑکی کی طبیعت کچھ خراب بھی رہتی ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے واسطے موٹر ہے، اور اس دھوکے سے لاکر اس میں سوار کردوں گا۔ اس کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ اس سے کوئی بات نہ کریں خاموشی سے بٹھائے لئے چلے جائیں۔ محل میں جاکر پھر جو بھی ہو اس کے ذمہ دار آپ ہیں۔ جو کچھ بھی انتظام کرنا ہو کرلیں۔ رہا میرا اور میرے آدمیوں کا معاملہ تو اب جو قسمت میں بدا ہو۔ لڑکی کے غائب ہوتے ہی اس کے باپ اور بھائی میری بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔ نہ معلوم کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ تاہم اتنا تو مجھے ضرور ہی کرنا ہوگا کہ لڑکی کے چلے جانے کے بعد پولس میں باقاعدہ اطلاع کردوں۔ ورنہ میں کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ اس کے باپ اور بھائی کی زبان بند کرنے کے واسطے بھی ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ اور اس لئے میں حضور سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ دس ہزار سے کم میں یہ کام کرنے پر میں ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس میں مجھے کیا ملے گا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ پولس اور اس کے رشتہ داروں کو دے دلاکر کچھ مل گیا تو مل ہی گیا ورنہ گھاتے میں چکی پیسنا تو بدا ہی ہے۔ نواب صاحب میں تو پھر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے بس کی چیز نہیں۔"

سرکس بیس دن لال باغ میں ٹھیرا۔ اتوار کی شام کو آخری مرتبہ تماشا کر کے پیر کی صبح کو یہاں سے کوچ کا سامان ہونے لگا۔ صبح اندھیرے ہی سائیس گھوڑوں کو لیکر پیدل روانہ ہو گئے تھے۔ باقی جانوروں کے پنجرے چھکڑوں پر لادے جا رہے تھے۔ لوگوں کی چھولداریاں گرا گرا کر تہ کی جا رہی تھیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں مشغول تھا۔ ایک طرف ایک ہاتھی بیٹھا تھا۔ جس پر بہت سامان لدا ہوا تھا۔ اور اس پر چند

بندھے ہوئے تھے۔ اب یہ بھی روانہ ہونے کے واسطے تیار ہو گیا تھا۔ باقی ہاتھی ابھی یوں ہی کھڑے جھوم رہے تھے۔ مینیجر کا چھوٹا سا خیمہ ابھی لگا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے سامنے آرام کرسی پر لیٹا نواب صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ ایک آدھ آدمی اِدھر اُدھر سے آکر اس سے کچھ پوچھ گچھ جاتا تھا جس پر وہ ان کو معمولی ہدایتیں بھی دیدیتا تھا۔ اور پھر گھڑی کو دیکھ کر انتظار میں لیٹ جاتا تھا۔ نو بجے کے قریب نواب صاحب کے موٹر کا ہارن بجا۔ مینیجر فوراً اُٹھ کر قناتوں سے باہر گیا۔ وہاں ایک بہت بڑے موٹر بس جس پر پردے لگے ہوئے تھے نواب صاحب خود کُرتہ پیجامہ پہنے ڈرائیور کی جگہ بیٹھے تھے۔ مینیجر نے پاس جاکر سلام کیا۔ نواب صاحب کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ استعجاب سے سُرخ تھا۔ مُسکرا کر گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کہئے!"

مینیجر:۔ (اطمینان سے) سب انتظام ٹھیک ہر!

نواب صاحب:۔ (جلدی سے) بہتر ہے۔ پھر جایئے جلدی کیجئے۔

مینیجر:۔ (نہایت اطمینان سے) میری طرف سے مطمئن رہیں۔ اب آپ بھی تو مجھے اطمینان دلائیں۔ دیکھئے نواب صاحب اس واقعے کے بعد میرا آپ کے محل پر جانا کسی طرح ٹھیک نہ ہوگا۔ اور نہ آپ کا یا آپ کے کسی آدمی کا ہی آنا ٹھیک ہوگا۔ دوسرے کسی اور شخص کا بیچ بھی میں پسند نہیں کرتا۔

نواب صاحب:۔ (جلدی سے گدّی کے نیچے سے نوٹوں کا بنڈل گھسیٹ کر اور اُن کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے۔) آپ کی رقم آپ کے اطمینان کے واسطے موجود ہے۔ ایک ہاتھ سے لڑکی کو سوار کیجئے دوسرے ہاتھ سے اپنا معاوضہ لیجئے۔ جایئے جلدی کیجئے۔ میرا یہاں اس طرح زیادہ ٹھیرنا نازیبا ہے۔

مینیجر نے ایک دفعہ نوٹوں پر پھر نظر ڈالی۔ مُسکراتا ہوا قناتوں کے گھیرے کے اندر گیا۔ اپنے ڈیرے کے پاس جاکر اس میں جھانکا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اندر سے وہی لڑکی، وہی تماشا کرنے کا چُست لباس پہنے مسکراتی ہوئی نکلی اور مینیجر کے پیچھے پیچھے چل دی۔ باہر موٹر کا انجن پہلے ہی سے گنگنا رہا تھا۔ نواب صاحب اسٹیرنگ گیر دونوں

دونوں ہاتھوں سے تھامے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ جونہی یہ دونوں پاس آئے نواب صاحب نے للچائی ہوئی ایک نگاہ جلدی سے لڑکی پر ڈالی۔ اس کے گال سُرخ تھے، ہونٹوں پر لالی تھی۔ ماتھے پر سے ہوتا ہوا گدّی کے چاروں طرف ایک ربن بندھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے سیاہ بال کھلے شانوں پر پڑے تھے۔ وہ نواب صاحب پر ایک نگاہ ڈالتی ہوئی مسکراتی موٹر کے پاس آئی۔ مینجر نے دروازہ کھول دیا اور وہ اس میں بیٹھ گئی۔ مینجر دروازہ بند کر کے نواب صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے کھسکتے ہوئے موٹر میں سے نوٹوں کا بنڈل مینجر کو دے دیا۔ اور رفتار بڑھا دی۔ لمحہ بھر میں موٹر سامنے کے موڑ پر گھوم کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ قناتوں سے باہر فٹ پاتھ پر مینجر صاحب تنہا مسکراتے ہوئے نوٹوں کے گڈے میں سے پرتیں ہٹا ہٹا کر کچھ دیر دیکھتے رہے اور پھر ان کو پتلون کی جیب میں ٹھونستے ہوئے اندر روانہ ہوئے۔

موٹر سڑک پر غیں غیں۔ اِدھر گھوم، اُدھر گھوم یہ جا وہ جا نکلا چلا گیا۔ یہاں تک کہ شہر کا کنارہ آ گیا۔ اور اب وہ سیدھا ڈلیا باد کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں پوری پختگی اور احتیاط کے ساتھ سب انتظام ہو چکے تھے۔ محل کے زنانے پھاٹک میں جونہی موٹر داخل ہوا بڑا پھاٹک بند کر لیا گیا۔ اس کے اندر کے صحن میں دو چار کیاریاں، چند درخت اور پودے تھے۔ ایک طرف تین چار مُلازم بیٹھے تھے۔ ایک لمبے دالان کے سامنے اُونچا سا چبوترہ تھا، موٹر اس کے سامنے رُکا۔ موٹی سی ادھیڑ عمر کی ایک ماما چاندی کا منوں زیور پہنے موٹر کے پاس آئی۔ دروازہ کھولا۔ بڑے ٹھسّے سے بولی۔ "اُتریئے۔ آیئے میرے ساتھ چلی آیئے۔" لڑکی اب بھی اسی طرح خاموش مسکراتی ہوئی خوش خوش پھُرتی سے اُتری اور اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے چل دی۔ ماما نے برامدے کے کونے پر ایک دروازہ کھولا۔ یہ زینہ تھا۔ دونوں اُوپر چڑھے۔ ایک اور چھوٹا سا صحن ملا۔ اس کے دوسری طرف ایک بہت بڑا آراستہ کمرہ تھا۔ جس میں زمین پر فرش قالین، گاؤ تکئے تھے۔ دیواروں پر بھدّی رنگین تصویریں اور بڑے بڑے آئینے تھے۔ ایک طرف ایک بہت بڑی مسہری مچھردانی سے ڈھکی ہوئی تھی۔

دوسری طرف تختوں کا چھوٹا سا تختہ تھا۔ اس پر بھی چاندنی قالین گاؤ تکیہ وغیرہ لگے جا بجا چاندی کے اُگال دان رکھے تھے۔ قالینوں کے کونوں پر اگر کی بتیاں جل جل کر خوشبودار دھوئیں سے کمرے کو معطر کر رہی تھیں۔ ایک چوکی پر لوٹا صراحی، صابن دانی، بیسن دانی سب چاندی کے رکھے تھے۔ فرش پر گاؤ تکیے کے برابر قالین پر ایک گنگا جمنی پاندان، دوسری طرف آبنوسی عطردان رکھے تھے۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی میز پر سبز اور سُرخ رنگ کے پٹاخے دار خوان پوش سے ڈھکی ایک سینی رکھی تھی۔ کمرے کی چھت اور دیواریں طرح طرح کے رنگوں سے بنے ہوئے پھول اور پتیوں سے نظروں کو گھائل کیے دیتی تھیں۔ چھت میں رنگین شیشے کے دو جھاڑ لٹک رہے تھے۔ ماما لڑکی کو لئے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئی۔ تختوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور اُلٹے پیروں واپس لوٹ گئی۔

لڑکی نے خوشی سے مُسکراتے ہوئے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی، ہر چیز کو حیرت سے دیکھا۔ تختوں کے پاس گئی۔ پیر لٹکا کر بیٹھی لیکن فوراً ہی جھک کر آبنوسی عطردان کو چھُوا۔ اور پھر سیدھی ہو گئی۔ چاروں طرف دیکھا کہ کوئی دیکھتا تو نہیں ہے۔ پھر جُھک کر عطردان کے نقوش پر ہاتھ پھیرا۔ نواب صاحب انگنائی کی دوسری سمت کے ایک کمرے میں سے جھانک رہے تھے۔ باہر آ کر ہنستے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے "ہاں ہاں عطر لگاؤ۔ عطر لگاؤ۔ یہ تمہارے ہی واسطے ہے۔" ان کے آنے پر لڑکی سیدھی ہو بیٹھی۔ اور ان کی طرف دیکھ کر زیرِ لب مُسکرائی۔ نواب صاحب نے اور آگے بڑھتے ہوئے کہا "کس غضب کی تمہاری مُسکراہٹ ہے۔" اور، اور آگے بڑھے۔ دونوں ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھائے۔ آناً فاناً میں لڑکی کے مُسکرانے میں تغیر پیدا ہوا۔ ہنسی غائب ہو کر متانت پیدا ہوئی۔ متانت سے پریشانی اور پریشانی سے غصہ کے آثار اس کے چہرے پر آئے۔ اب وہ ساکت کھڑی اس سفید بوڑھے کو غصہ سے تک رہی تھی۔ نواب صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ "دُنیا کا ہر عیش یہاں تمہارے واسطے مہیا کر دونگا اب تم کو میرا ہی ہو کر رہنا ہوگا۔" پھر اپنا ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ لڑکی پھُرتی سے

ایک قدم پیچھے ہٹی۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے چہرے کو رگڑ ڈالا۔ پھر کندھوں پر پڑے ہوئے گیسو سر سے نوچ نواب صاحب کے سامنے زمین پر دے مارے۔ اور اس کے بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنی آواز نکالی "آ وا وا آ، آ وا وا وا آ" نواب صاحب مجسمہ حیرت بنے ساکت کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے چودہ برس کی بدہیئت گونگی لڑکی غصّہ میں بھری بے ہنگم آوازیں نکال رہی تھی۔ زور زور سے ہاتھ رگڑنے سے اس کے چہرے کا غازہ جابجا سے اُڑ چکا تھا۔ جس سے کہ اس کا اصلی سیاہ رنگ چتکبرا ہو گیا تھا۔ چہرے پر ایک زخم کا بدنما داغ دائیں گال سے لیکر کنپٹی تک چلا گیا تھا۔ دوسرا داغ خش خش بالوں سے آراستہ سر کے بیچوں بیچ نمایاں چمک رہا تھا۔

وہاں نہ باپ تھا نہ بھائی۔ مکروہ صورت لاوارث لڑکی، فکر کون کرتا۔ البتہ گھوڑی کی فکر میں سب ہی پڑ گئے۔ کانپور پہونچ کر اب ہر ایک کی یہ کوشش ہونے لگی کہ لڑکی کی جگہ وہ لے لے۔ انھوں نے طرح طرح سے اسے رام کرنیکی فکر کی لیکن پیار، دلاسہ، مار پھٹکار کچھ بھی کارگر نہ ہوئے۔ کیونکہ بچپنے سے انہی لوگوں نے روزانہ اس کے ہزاروں سوئیاں چبھو چبھو کر اسے دُنیا بھر کے انسانوں سے خائف کر دیا تھا۔ یہ لوگ سرکس کے گھیرے میں لاکر طرح طرح کے لباس بدل کر اس کے پاس آتے تھے اور اس کے سوئیاں چبھویا کرتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک وہ تھان پر بندھی ہے خیریت ہے اور جہاں اس جگہ سے ہٹی یا آزاد ہوئی سوائے اس لڑکی کے جو بھی پاس آئیگا کسی نہ کسی طرح سوئی ضرور چبھوئے گا۔ اس کو ہر انسان سے دلی نفرت اور عداوت ہو گئی تھی۔ اس کی قدرتی محبّت کا رُجحان دُنیا بھر سے سمٹ کر اس لڑکی پر قائم ہو چکا تھا۔ وہ نو عمر بے زبان جانور عاشق کی طرح محبّت کرنے کو بیقرار معشوق کی طرح محبت کئے جانے کا منتظر۔ صرف ایک ہی ہستی اس گونگی لڑکی کی منتظر کالی گھوڑی خاموش کھڑی سر کو جھٹکے دیتی اور دُم سے مکھیاں جھلتی تھی۔ نہ آنکھوں میں اشک نہ لب پر فریاد۔ اگاڑی پچھاڑی بندھی کھڑی ہے۔ کبھی دو ایک مُنہ گھاس کھالی اور کھڑی ہے

کان آگے کئے۔ پیچھے سے سر کو جھٹکے دیئے۔ دُم کی چوری چل رہی ہے۔ خاموش کھڑی ہے۔ اس خاموشی میں انتظار ہے۔ غم نہیں ہے اور پھر انتظار ہے۔ اس پر طرح طرح کے ظلم ہوئے۔ طرح طرح کی مار پڑی۔ ہر ہر طرح سے اس پر سوار ہونے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کو لڑکی کا انتظار تھا، وہی اس پر سوار ہو سکتی تھی۔ دوسرے کو کیسے پاس آنے دیتی۔ یہاں تک کہ جب پیروں میں سندے ڈال کر اور منہ پر جھرا باندھ کر اس کو چلنے، دولتی چلانے اور کاٹنے سے بھی بالکل ناکارہ کر دیا گیا تو پھر اس نے دھڑا دھڑ اپنے تئیں کھڑے قد سے گرا گرا دیا لیکن کسی کو سوار نہ ہونے دیا۔ اسی طرح کی دن دن بھر اس پر سختیاں ہوئیں۔ اور جب بھی لوگوں نے ہار کے جھک مار کے پھر اسے تھان پر لا کے باندھا۔ وہ خاموش کھڑی ہو گئی۔ نہ آنسو نہ آواز نہ سرد آہیں نہ فریاد۔ خاموش! خاموش بے زبان کی ایک وہی زبان خاموشی۔ سر کو دو ایک جھٹکے دیئے، دُم ہلائی، خاموش کھڑی ہے، گھنٹوں کھڑی ہے۔ دو جھٹکے سر کو دیئے دُم ہلائی اور کھڑی ہے۔ سرکس والوں میں ادھر یہ ہو رہا تھا کہ "اچھا اب سالی کو جلاب اور فاقے دیئے جائیں" ادھر اس نے خود دانہ اور گھاس چھوڑ دیا۔ بانسوں کی مار سے اور کھڑے قد سے گر گر پڑنے سے بدن پھوڑا ہو رہا تھا۔ لڑکی کی یاد میں دل بیقرار تھا۔ ہر طرف آنکھیں اسی کو ڈھونڈتی تھیں۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ اوپری چوٹیں اندرونی غم۔ چند دن اور جو گذرے تو گھوڑی کی صورت ہی اور ہو گئی۔ بھڑکتی، تھرکتی ہوئی موٹی تازی سیاہ چمکتی بچھڑی کے بجائے سُست، مریل، میلی، سیاہ، کھچی کھچی گردن سر جھکائے اونگھتی ہوئی سی کھڑی ہے۔ ٹانگوں پر مکھیاں آنکھوں پر بھنگے چمٹے ہوئے ہیں۔ کبھی دُم ہلالی تو ہلالی ورنہ سر نیچا ہے کھڑی ہے۔ عجیب حالت ہو گئی۔ آخر ایک دن جب سرکس کانپور سے بھی کوچ کرنے لگا اس کا نیلام بول دیا۔ بتیس روپے اور مالک سرکس کی جیب میں آئے اور گھوڑیا بھی یہاں سے رخصت ہو گئی۔ قصہ ختم ہوا چار دن کے بعد بھولے سے بھی کوئی کیوں ان کو یاد کرتا۔ کیسی لڑکی کس کی گھوڑی گھاس کوڑا، اس کا کیا۔ پڑا ہے تو پڑا ہے۔ نہیں تو آندھی آئی اُڑ گیا۔ پانی آیا بہہ گیا۔

یہ دونوں بھی دُنیا کے سمندر میں تھپیڑے کھاتے بہتے چل دیئے۔ ایک مشرق اڑا دوسرا مغرب بہا۔ پتھر کی سلیں دل کے عارضے سے آزاد بجیں صدیوں پہاڑوں پر بیٹھی جلتی رہیں۔

جاڑے جاتے ہیں، بہاریں آتی ہیں۔ جُگ پر جُگ۔ صدیاں آتی اور جاتی ہیں قوموں پر قومیں آتی ہیں۔ نسلوں پر نسلیں جاتی ہیں۔ پر یہ بیٹھی بیٹھی تکتی ہیں اور ہم آندھی کے تنکے اب اُڑے۔ جب گرے پل بھر ہی اُڑتے ہیں۔ پھر بھی قسمت کے مارے اُلفت! محبت، یاس و حسرت، آرزو اور تمنا کا گھروندا یعنی لپ لپ کرتا دل پہلو میں لئے پھرتے ہیں۔ اتفاق نے اکٹھا کر دیا، مل گئے۔ حادثات نے جُدا کر دیا الگ ہو گئے۔ نہ اس کا کوئی گھر نہ دوارا۔ سرکس کی زندگی کیا تھی صبح کا خواب تھا۔ چونکے تو کچھ نہ تھا۔ گھوڑی کیلئے بکہ تھا بجّہ والا تھا۔ کانپور کی سڑکیں، گلیاں تھیں۔ اُدھر لڑکی کیلئے چولھا تھا۔ برتن تھے۔ سل تھی اور بٹہ تھا۔ اور دو بیبیوں کی خدمت تھی۔ مصالحہ پیسنا، برتن مانجھنا کھانا پکانا، گھر بھر کو کھلانا۔ بچا کھچا خود کھانا اور پھر اسی کو دوہرانا۔ یہی زندگی تھی۔ برس پر برس گذرے۔ گونگی لڑکی، بے زبان، سل پر ہلدی دھنیا، مرچیں، دونوں ہاتھوں میں بٹہ، اکڑوں بیٹھی، آگے پیچھے ہل، ہل ہل جسم مجسّم مصالحہ پیسنے لگا ہے۔ اور دل! کمبخت دل! سرکس، سیاہ گھوڑی، گھوڑی کی محبت بھری نگاہیں، اس کی خمیدہ گردن۔ اس کا خوشنما ماتھا، اس کا سر گھما کے دیکھنا۔ اس کا تھرکنا، اس کا ملنا۔ اس کو گھاس دانہ دینا۔ اس کی دوڑ، اس کی سواری؛ اس پر کرتب، ہزاروں آدمیوں کا حیرت سے دیکھنا۔ وہ تالیاں وہ تالیاں! جب دُنیا تکتی تھی، دُنیا حیرت کرتی تھی۔ یہی زندگی تھی، یہی زندگی کا معراج تھا۔ لیکن یہ سب نہ آنکھیں دیکھ سکیں نہ کان سُن سکے۔ لوگوں سے نہاں، دُنیا سے پنہاں، گیلی گادہ لکڑیوں کے دھوئیں میں پھُو کرتے ہوئے کالی چکنی ہنڈیوں کو سر سر لئے جاڑوں کی راتوں میں ہانپتے ہوئے نہ مٹنے والی اور نہ ٹلنے والی یاد بے زبان کو ستاتی تھی۔ جاڑوں میں کٹ کٹ کانپتے ہوئے۔ گرمی میں پسینے سے بشرابور ہانپتے ہوئے برسوں برسوں گونگی نے دہی گذا کی

ہوئے دن یاد کئے۔ پر قسمت نے کسی پہلو کوئی پلٹا نہ کھایا۔ اور زمانہ پلٹا بھی تو کیا پلٹا، نہ ماں باپ تھے نہ بھائی بہن، نہ رشتہ دار تھے نہ ملنے والے۔ شوہر نہیں اولاد نہیں اس کی زندگی میں کوئی تغیر ہو ہی کیا سکتا تھا۔ امید بھی کیا ہوتی، تمنّا ہی کیا ہوتی۔ بے آسرا بے آرزو دن کٹتے گئے۔ نواب محمود علی خاں نے چیخ چلّا کے ندامت اور خجالت کا غصہ نوکروں پر اتار کے لڑکی کو کالے خاں باورچی کے سپرد کر دیا تھا۔ اور ہدایت کر دی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔ آپ نواب صاحب کے ملازم بقدر حیثیت خود بھی آقا کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔ زیادہ نہیں تو گھر میں دو ہی بیویاں تھیں۔ لڑکی تھی کم عمر، ان دونوں نے اس خیال سے کہ کہیں سوتن بن کر نہ کھڑی ہو خوب ہی دُرگت بنائی۔ چڑھتے شباب میں لڑکی ان کے حوالے کی گئی تھی۔ مگر بیویوں نے سلیقہ سے شباب کو بڑھاپے میں بدلنا شروع کر دیا۔ چند سال میں لڑکی سے بڑھیا ہو گئی۔ جوتے کھاتے خدمت کرتے پندرہ برس گذر گئے۔

ہم روز دیکھتے ہیں کہ صبح کو ہلکی روشنی میں ہر چیز خوشحال تر و تازہ شاداب ہوتی ہے۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں، پھول مسکراتے ہیں۔ سبزہ لہلہاتا ہے اور پھر چند ہی گھنٹے بعد چوندھیاتی دھوپ میں ہر چیز دہکتی ہے جھلستی ہے، ہوائیں گرم اور خاک آلود ہو جاتی ہیں۔ چڑیاں اِدھر اُدھر چھپ جاتی ہیں، پھول نڈھال ہو کر کمھلاتے اور گرتے ہیں۔ ہریاول پر دھوپ پڑتی ہے خاک چھاتی ہے، دن رات یہی قدرت کے پلٹے ہیں۔ پھر کونسی حیرت کی بات ہے سرکس کی وہ تندرست سیاہ چمکتی شوخ گھوڑی کانپور میں نیلام ہونے کے چند دن بعد یکہ میں جُتنے والی گھڑیا ہو گئی۔ وہی پیٹھ پر کسی کو نہ بیٹھنے دیا تو کیا؟ کھڑکھڑاتا بھاری یکہ دُم کے پیچھے لگ گیا۔ اب ٹخ ٹخ ٹمر ٹپا سٹاسٹ چابک، دن بھر شہر کی گلیاں اور اسٹیشن کے پھیرے ہونے لگے۔ دن بھر کی تھکی شام کو گھر آئی۔ ڈھیر سی ٹلائی ہوئی۔ تھوڑی گھاس ملی۔ رات بھر مچھروں نے کاٹا۔ صبح ہوئی پھر چل دی شہر بھر کی خاک چھاننے، نہ شباب رُکا نہ جوانی

ہی آئی۔ اس مار اور محنت سے دونوں ہی بھاگ گئے۔ بچھیری سے بچّہ کی گھڑیا ہوگئی۔ اسٹیشن پر جُتی کسی کھڑی اونگھ رہی ہے۔ مزدوری مل گئی۔ سامان رکھا گیا سواریاں بیٹھ گئیں تو یکّے والے نے راس کو دو جھٹکے دیئے، چابک چلایا: "ٹخ ٹخ" کی۔ گھڑیا نے دُم ہلائی۔ سر اُوپر نیچے اوپر نیچے ہلایا۔ اور پھر مُنڈیا نیچے۔ غوطہ میں کھڑی ہوگئی۔ "او گھوڑی او گھوڑی تیرا ستیاناس ہو چل۔ ٹخ ٹخ۔ ٹخ ٹخ۔ سٹ چابک سٹ چابک" گُڑیا نے پھر دُم ہلائی۔ سر ہلایا۔ دُم ہلائی سر ہلایا۔ اور کھڑی ہے۔ پھر اس کو کرارے جھٹکے دیئے گئے "او گھوڑی او گھوڑی چل تیرا ستیاناس لگے۔ ٹخ ٹخ، ٹخ ٹخ" اب پیروں سے زیادہ سر کو اوپر نیچے ہلاتی ٹھمک ٹھمک گھوڑی چل پڑی۔ تو اور سٹا سٹ سٹا سٹ چابک پڑنے لگے "چل او گھوڑی چل چل چل۔ او گھوڑی او گھوڑی تیرا ناس ہو۔ ٹخ ٹخ۔ ٹخ ٹخ" اسی ٹخ ٹخ میں گھوڑی کی عمر کٹ گئی۔ پندرہ برس ہو گئے، بوڑھی ہوگئی۔ پیر کانپنے لگے، راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ ایک روز حسب معمول گھڑیا یکّہ کھینچتی ٹھمک ٹھمک چلی جا رہی تھی۔ بازار میں ایک جگہ اسے روکا گیا۔ رُک گئی۔ مُنڈیا نیچی کر کھڑی ہوگئی۔ یکّے پر پردے پڑے تھے۔ اس میں دو زنانی سواریاں تھیں، ایک مرد ساتھ تھا۔ مرد وہی کالے خاں باورچی تھے۔ سواریوں میں ایک بیوی دوسری گونگی ماما تھی۔ کالے خاں نے ایک دکان پر سے زنانے گرگابی جوتے لا کے پردے کے اندر سر ڈال کے بیوی کو دکھائے، ان میں سے دو پسند آئے، پہن کر دیکھے، پھر اُن دو میں سے ایک لینے کو بتا دیا۔ میاں جوتے لیکر پھر دُکان کی طرف چلے۔ بیوی کی نیت اس جوڑے سے اس جوڑے پر ڈانوا ڈول ہوئی۔ اب کیا کریں۔ گونگی کو اشارہ کیا۔ بُلا میاں کو بُلا۔ وہ بیچاری اپنی زبان میں چلّائی "آ۔ دادا۔ دا۔ آدا" پژمردہ دل بوڑھی گھوڑی نے برسہا برس کے بعد پھر وہی آواز سُنی۔ وہی آواز جو کبھی محبت کا پیغام تھی۔ وہ آواز جس سے زندگی کی گذری ہوئی پُر مسرت گھڑیاں وابستہ تھیں۔ یکایک یہ آواز جو آئی۔ گھوڑی چونک دونوں کان پیچھے دبا خاموش کھڑی ہوگئی۔ بازار کی چیخ پکار میں میاں نے آواز نہ

سُنی ۔ اس لئے گونگی نے پھر وہی آواز نکالی ۔ گھوڑی نے کان آگے پیچھے ہلاتے ہوئے پھر اس آواز کو سُنا ۔ دُنیا کی تمام آوازوں میں یہی ایک آواز تھی جو اس سے تعلق رکھتی تھی ۔ برسوں برسوں اس کیلئے کان ترستے رہے تھے ۔ برسوں برسوں سے اس آواز کے سُننے کی ناامیدی ہو چکی تھی " یہ آواز ، یہ آواز ۔ لڑکی آگئی ۔ مل گئی ۔ کہاں ہے ؟ چلی جائیگی ۔ پھر نہ ملے گی ۔ کیا کروں ۔ کیا کروں " غالباً کچھ اسی قسم کے خیال گھوڑی کے دماغ میں آئے ہونگے یا جو کچھ بھی ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ دوسرا کے جو گھوڑی نے اس آواز کو سُنا تو پھر یہ معلوم ہوا کہ اس مریل گھوڑی میں کسی نے بجلی بھر دی ۔ اس نے ایک دفعہ ہنہنانے کی تڑپ ماری ۔ جال میں پھنسے ہوئے جنگلی ہرن کی طرح وہ تڑپی اور پھڑکی ۔ دیکھتے دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ گھوڑی آزاد بموں میں سے نکل یکّے کے چاروں طرف پھرنے لگی ۔ وہ رُکتی ۔ بھاگتی ۔ کبھی الف ہوتی ۔ کبھی دولتیاں چلانے لگتی ۔ کان سُکیڑے ، دانت نکالے ۔ یکّہ کے گرد گھومنے لگی ۔ چاروں طرف سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے تھے لیکن سب خوف زدہ بھاگنے کے واسطے تیار دُور ہی سے تماشہ دیکھ رہے تھے ۔ ان ہی میں یکّہ والا اور میاں کالے خاں بھی شامل تھے ۔ جو کہ فاصلہ ہی سے نمایاں اُچھل کود اور بلند قہقہوں سے اپنی وابستگی اس غلاف پوش یکّے سے ظاہر کر رہے تھے ۔ جو کہ اب ٹیڑھا بموں کو لٹکائے رکوع کی حالت میں خاموش کھڑا تھا ۔ اور اس کے اردگرد خوفناک ، وحشی ، کالی گھوڑی اس ارادہ سے طواف کر رہی تھی کہ اگر کوئی پاس آیا تو جان ہی لے لوں گی ۔ اور سفید پردے کا یکّہ بیچ میں عجیب مظلومیت سے ساکت ٹیڑھا جھکا کھڑا تھا ۔ دراصل یہ معلوم ہو رہا تھا کہ دعا مانگ رہا ہے ۔ اس کے پردوں کے اندر بھی بالکل خاموشی تھی ۔ بیوی ڈر کے مارے بیہوش ہو چکی تھیں ۔ گونگی پردہ کا ایک کونہ ہٹائے یکّہ کے ڈنڈے پکڑے مدہوش بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی ۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو برابر ایک کے بعد ایک گالوں پر سے بہہ کر ٹپ ٹپ گر رہے تھے ۔ اس کے چاروں طرف دو ہزاروں آدمیوں کا ہیجان تھا

اور ار دگرد گھوڑی کے وحشیانہ کرتب تھے۔ اس نے اس وقت پھر اپنی پُرانی دُنیا کو پھر ایک دفعہ زندہ ہوتے دیکھا۔ اس کے مُردہ ہاتھ پیروں میں ایک رُوح سی دوڑی۔ وہ پردے ہٹا یکّے سے کُود سڑک پر لمحہ بھر کھڑی ہوئی اور پھر ہزاروں ششدر آدمیوں کے سامنے وہ بدصورت لاغر ادھیڑ عمر کی عورت گھوڑی کی طرف لپکی اور اُچھل اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑی بھی جدھر اُس کا مُنہ تھا ادھر ہی سیدھی سرپٹ دوڑ پڑی۔ لوگوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹتی گئی۔ اور گھوڑی تیر کی طرح نکل یہ جا وہ جا نکلی چلی گئی۔

بوڑھی عورت کو لئے بوڑھی گھوڑی بے تحاشا بھاگی۔ چوراہوں پر ہوتی جگہ بجگہ گھومتی بازاروں میں کتراتی بھاگتی چلی گئی۔ محلوں پر محلے گزر گئے۔ اور وہ بھاگتی ہی چلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ شہر کا کنارہ بھی آیا اور نکل گیا۔ اب لمبی سیدھی کالپی روڈ تھی۔ اس پر بھی وہ دونوں میلوں میلوں چلے گئے۔ پانچ اور دس اور پھر پندرہ میل ہو گئے تو پھر وہ دونوں مسکین بے زبان مسافر اسی اصلی منزلِ مقصود کو پہونچ گئے۔ جدھر ہم سب دُنیا کے مسافر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ پندرہ میل کے بعد بڈھی گھوڑی کے پیر لڑکھڑائے۔ سرپٹ بھاگتے میں ٹھوکر کھائی۔ مُنہ کے بل زمین پر گری۔ اس کا بھی سر پاش پاش ہو گیا۔ گونگی عورت کی بھی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جس نے کہ گھوڑی سے بھی دس گز آگے پکی سڑک پر پٹخنی کھائی تھی۔

اے دلہت! نہ رنجیدہ ہو۔ یہی وہ آخری منزلِ مقصود ہے جس کے حاصل کرنے کے واسطے یہ دونوں جُدا جُدا جی رہے تھے۔ ورنہ اور کیا تھا۔ کس کا آسرا تھا۔ کس حصول کی تمنا تھی۔ شباب لُٹ چکا تھا

جوانی اُجڑ گئی تھی۔ بُڑھاپے میں ایک کہیں دوسرا کہیں کسی نہ کسی طرح راہیٔ ملکِ عدم ہوتے۔ چند منٹ کی ہی سہی آخر یکجائی پھر ہوئی۔ پھر وہی شباب کا مشغلہ چندے نصیب ہوا۔ اور یہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ڈراپ سین ہوا۔

ختم شُد

(مکتبہ نشاط۔ مارچ ۱۹۴۶ء)